خوشبو یادوں کی

(۳۶ تاثراتی مضامین کا مجموعہ)

تمہیں کس طرح بھولوں میں شناسائی کچھ ایسی تھی
مرے ہر گوشۂ دل میں ابھی یادوں کی خوشبو ہے

صلاح الدین نیّر

تاریخ و سنِ اشاعت .... ۵ / جنوری ۲۰۰۳ء
تعدادِ صفحات ۲۰۶
تعداد اشاعت ۵۰۰
قیمت .... ۱۵۰ روپے
لائبریری ایڈیشن .... ۲۰۰ روپے
کتابت .... سید انور احمد
طباعت .... اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
ناشر .... صلاح الدین نیر

ملنے کا پتہ

▲ سیاست سیل کاونٹر ۔ جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد ۱
▲ حسامی بکڈپو مچھلی کمان پتھر گٹی حیدرآباد ۲
▲ مصنف ۔ کہکشاں ۸۲۴/۷-۳-۱۱ اسلے پلی حیدرآباد ۱

فون نمبر 3340015

اِنتساب

اِس کتاب میں شامل اُن تمام قلم کاروں کے نام
جن کی "یادوں کی خوشبو" آج بھی میرے اوراقِ دل
کو مہکا رہی ہے۔

صلاح الدین نیّر

ترتیب و تزئین

خوشبو یادوں کی

"خوشبو یادوں کی" میری ۲۸ ویں کتاب ہے جس میں میرے ۳۶ تاثراتی مضامین شامل ہیں اور جو ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب سے پہلے میری اور مجھ سے متعلق ۲۷ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں گیارہ شعری مجموعے شامل ہیں اس کتاب میں جن شخصیتوں پر میرے مضامین شامل ہیں وہ یادِ ماضی کا حصہ بن چکی ہیں جو شاعر بھی تھے، ادیب بھی، اڈمنسٹریٹر بھی تھے، قانون داں بھی، صحافی بھی تھے معلم بھی، فنکار بھی تھے صلاح کار بھی۔ اس کتاب میں، میں نے حیدرآباد، اضلاع آندھرا پردیش، اور اضلاع حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والی ایسی شخصیتوں پر لکھے ہوئے مضامین شامل کیے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے شعبۂ حیات میں قابلِ قدر و نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ تمام ایسے لوگ ہیں جن سے میں شخصی طور پر واقف ہوں جن کے ساتھ میں شعری و ادبی، تہذیبی و ثقافتی محفلوں میں شریک رہا ہوں۔ جن کا مجھے تعاون حاصل رہا اور جنھیں میں نے اپنا تعاون دیا تھا۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے ذریعہ سے میں اُن شخصیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی "یادوں کی خوشبو" میرے جسم و جاں کو مہکا رہی ہے میں یہ بات واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے صرف اُن ہی شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے جن کا زندگی کے کسی نہ کسی حصہ میں مجھ سے تعلق رہا ہے اور نہ جنھیں میں نے قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جن سے میری علیک سلیک تو ہوتی ہے لیکن دل و دماغ نے اُن سے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ ظاہر ہے ہر ملنے جلنے والا شخص دوست نہیں بن سکتا۔

میرے تاثراتی مضامین پر مشتمل میری دو کتابیں ۲۰۰۱ء میں اور دو کتابیں ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئیں۔ ۲۰۰۱ء میں ایک اور ضخیم کتاب "عالم الطاف فن اور شخصیت" بھی شائع ہوئی جو ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ خوشبو یادوں کی ۲۰۰۳ء کی پہلی کتاب ہے۔ خوشبوئے بہاراں (۲۰۰۱ء) میں بہ قید حیات ۲۰ شخصیتوں پر، "ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" میں ۲۱ شخصیتوں پر۔ (جو اوراقِ ماضی سے تعلق رکھتی ہیں) ان کے علاوہ "روشنی خوشبو مہک" (۲۰۰۲ء) میں بہ قید حیات ۷۰ شخصیتوں پر اور ۲۰۰۳ء ہی میں ایک اور کتاب "مہک پھولوں کی" جس میں ۳۴ بہ قید حیات شخصیتوں پر مضامین شامل ہیں اس طرح (۲۰۰۱ اور ۲۰۰۲ء) ڈیڑھ سال کی مدت میں میں نے تاثراتی مضامین پر مشتمل چار کتابیں لکھیں جن میں ۱۴۵ شخصیتیں شامل ہیں اس کتاب خوشبو یادوں کی (۲۰۰۳ء) میں ۳۶ مضامین شامل ہیں اس طرح اس مختصر عرصہ میں ۵ کتابوں میں ۱۹۰ شخصیتوں پر میرے تاثراتی مضامین شائع ہو چکے ہیں ان کتابوں کے علاوہ میری پچھلی کتابوں سلسلہ پھولوں کا (۱۹۹۲ء) پھر وہی پرچھائیاں (۱۹۹۳ء) اور کہکشاں (۱۹۹۱ء) میں بھی زائد از ۵۰ شخصیتوں پر میرے تاثراتی مضامین شامل ہیں جبکہ بعض کتابوں میں کچھ شخصیتوں پر مضامین کا اقتباس شامل کیا ہے تاکہ قارئین کو کچھ لوگوں کی کمی کا احساس نہ ہو آتی سلسلے کی ایک کتاب سائبان (محبوب حسین جگر ۱۹۹۶ء) بھی ہے اس کتاب میں محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست کی شخصیت اور صحافتی خدمات کے علاوہ جناب عابد علی خاں مدیر سیاست کی خدمات پر بھی میں نے روشنی ڈالی ہے۔ میں نے اپنی ۴۰ سالہ ادبی زندگی میں کئی سو ویژنر تیار کیے یہاں زائد از ۵۰ کتابیں میری زیر نگرانی شائع ہوئیں۔ خدا

کا شکر ہے کہ میری سبھی کتابیں ادبی حلقوں اور عام پڑھنے والوں میں پذیرائی
حاصل کر چکی ہیں۔ سالِ رواں میں انشاء اللہ خوشبو کا سفر کے منتخب ادارئیوں
پر مشتمل کتاب شائع ہوگی اور مجموعۂ کلام بھی شائع ہوگا۔
جناب انور مسعود صاحب نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ کتابت کی

جن کا میں ممنون ہوں۔ اعجاز پرنٹرس کے مالک اعتراز محمد اور ان کے چچا ممتاز احمد
نے بھی مجھے اپنا بھرپور تعاون دیا ہیں ان دو حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں
میں اپنے ان تمام دوستوں کا بھی سپاس گزار ہوں جو میری شعری و ادبی مصروفیات
کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

کہکشاں۔ حیدرآباد　　　　　　صلاح الدین نیّر

نواب میر احمد علی خان

(با اصول، با کردار، اعلیٰ انسان، سابق وزیر داخلہ)

جہاں کہیں بھی شہر کی وضع دار شخصیتوں کی فہرست ترتیب دی جائے گی وہاں مرتبین فہرست کو قطعی یہ دشواری پیش نہیں آئے گی کہ اولیت کن کن شخصیتوں کو دی جائے۔ اس بات کا انحصار ان مرتبین کے مشاہدات، تجربات پر ہے کہ وہ ہر وضع دار شخص کے بارے میں کس حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ یک نظر کسی کے بارے میں قطعی رائے قائم کی جائے۔ پہلے اُس مخصوص شخص کی مکمل زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے اُس کے اطوار، اُس کے رہن سہن، اُس کے اخلاق اور معاشرہ میں اس کے طرز عمل کی کیا اہمیت ہے اس پر غور کیا جاتا ہے۔ وضع داری ایک ایسی مکمل کیفیت کا نام ہے جس کے اطراف اچھائیوں کی تیز تر کرنیں جلوہ نما ہوتی ہیں۔ اچھائیوں کے ماحول میں جن کی بھی زندگی گزرتی رہتی ہے وہ اپنی اصول پسندی اپنے عمدہ خصائل کی روشنی میں اپنی قابل ستائش سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے ہیں وضع دار لوگ اپنی عمدہ روش پر تاحیات قائم

رہتے ہیں۔ وضع دار لوگ الگ پہچانے جاتے ہیں وضع دار لوگوں میں اقدارِ اعلیٰ، تہذیب گذشتہ اور مہذب معاشرہ کی جلوہ سامانیاں ہر وقت جھلکتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی حرکات و سکنات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وضع دار لوگ ہیں ویسے بھی اتنی بڑی سوسائٹی اور اتنے وسیع معاشرہ میں وضع داروں کی تعداد بہت کم رہتی ہے ایسے لوگ وضع داری کی اولین فہرست میں نمایاں رہتے ہیں جن کی ساری زندگی آئینۂ صفت' یا اصول اور نیک ساعتوں کی رہینِ منت رہا کرتی ہے۔ اگر ہم ہمارے شہر کی وضع دار شخصیتوں کی فہرست مرتب کریں تو ہمیں کچھ نام تو ایسے مل ہی جائیں گے جو زیادہ نمایاں ہیں۔ اُن نمایاں لوگوں میں ایک اہم نام نواب میر احمد علی خان صاحب کا بھی ہے میں اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ نواب میر احمد علی خان صاحب بھی حیدرآباد کے وضع دار لوگوں میں سے ایک تھے۔ نواب میر احمد خان صاحب کو میں تقریباً ۲۰ برس سے جانتا ہوں۔ وہ میرے کرم فرما رہے ہیں حالانکہ میں ایک نووارد شاعر تھا مگر انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے اُن کی موجودگی میں اکثر مشاعرے پڑھے ہیں نواب میر احمد علی خان انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اُس زمانے میں مولوی حبیب الرحمن معتمد انجمن تھے نواب میر احمد علی خان صاحب برسوں انجمن ترقی اُردو سے وابستہ رہے اور اپنے اعلیٰ اثر و رسوخ سے زبان و ادب کی خدمت کی۔ اُن کے زمانے میں انجمن ترقی اُردو کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ جناب عابد علی خان شریک معتمد تھے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، منوہر راج سکسینہ، ڈاکٹر حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی بھی سرگرمِ عمل

رہا کرتے تھے۔ نواب صاحب کی سرپرستی میں نے کئی اضلاع کے مشاعرے پڑھے ہیں اُس زمانے میں تقریباً ہر ضلع میں انجمن ترقی اُردو کے سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ جن میں مشاعرہ کا بھی اہتمام رہتا تھا مغل پورہ میں اُردو گھر کے قیام کے سلسلے میں بھی نواب میر احمد علی خان نے خاصی دلچسپی لی۔ نواب صاحب صنعتی نمائش کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ کئی برس تک نمائش سوسائٹی سے وابستہ رہے۔ جس زمانے میں میں اُردو مجلس کا سکریٹری تھا نواب صاحب ادبی جلسوں اور مشاعروں میں بہ پابندی شرکت کرتے تھے۔ میں ۱۸ برس تک اُردو مجلس کا سکریٹری رہا۔ اُس دور میں شہر کے تقریباً تمام اہم سینئر و جونیئر ادباء و شعراء شریکِ محفل رہتے۔ شہر کے سینئر مشاہیر میں خاص طور پر میر احمد علی خان، ہارون خان شروانی، مولوی حبیب الرحمٰن رائے جانکی پرشاد وغیرہ موجود رہتے تھے۔ نواب میر احمد علی خان کانگریس جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب صاحب کانگریس کے دورِ حکومت میں حکومت آندھرا پردیش میں وزیر داخلہ رہ چکے ہیں۔ جس زمانے میں سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش جناب نیلم سنجیوا ریڈی صدر جمہوریہ ہند مقرر ہوئے تھے اُس مسرت میں شہریانِ حیدرآباد و سکندرآباد کی جانب سے پبلک گارڈن (باغ عامہ) میں شایانِ شان پیمانے پر اُن کا خیر مقدمی جلسہ منعقد ہوا تو اس جلسے میں صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں تہنیتی نظم سنانے کے لیے نواب صاحب نے مجھ سے خواہش کی تھی حالانکہ اُس زمانے میں حیدرآباد میں بہت ہی اچھے اچھے شاعر موجود تھے لیکن نواب صاحب نے مجھ سے اپنی محبت اور میری شاعری کو اپنی پسندیدگی کی سند عطا کرتے ہوئے پروگرام میں میرا نام شامل کیا تھا میری نظم

سماعتی پسند کی گئی۔ جب میں نے اپنی نظم ختم کی تو صدر جمہوریہ نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھ سے اظہارِ خوشنودی کے طور پر مصافحہ کیا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے تلگو میں اپنی تہنیتی نظم سنائی تھی ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سے اس تقریب میں میرا پہلا تعارف تھا۔ اردو شاعر کی حیثیت سے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ نواب میر احمد علی خان ادبی ٹرسٹ کے بھی صدر نشین رہ چکے ہیں جس کے بانی سکریٹری جناب عابد علی خان مدیر روزنامہ سیاست تھے جو تادمِ حیات اس عہدہ پر فائز رہے ادبی ٹرسٹ کے اجلاسوں میں نواب صاحب کی رائے کو تمام ارکان قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس دور کے ٹرسٹیز میں مولوی حبیب الرحمن، محامد علی عباسی، ایل۔ این گپتا، مخدوم محی الدین بھی تھے ایل۔ این۔ گپتا سکریٹری فینانس حکومت آندھرا پردیش بھی ادبی ٹرسٹ کے صدر رہے۔ محامد علی عباسی سکریٹری فینانس حکومت آندھرا پردیش بھی صدر نشین ادبی ٹرسٹ رہے اور جناب ہاشم علی اختر سکریٹری کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ سکریٹری بھی صدر نشین رہے۔ اس وقت ڈاکٹر سید عبد المنان ادبی ٹرسٹ کے صدر نشین ہیں اور جناب زاہد علی خان صاحب مدیر سیاست منیجنگ ٹرسٹی ہیں نواب صاحب کی صدر نشینی کے دور میں ان کے مفید مشوروں سے ٹرسٹ کے مالیے کو مستحکم کرنے کے لیے بار آور کوششیں جاری رہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے تمام ارکان ٹرسٹ کے مسائل کو خوش اسلوبی کے ساتھ طے کرتے تھے۔ نواب احمد علی خان مغل پورہ میں سکونت پذیر تھے ویسے ان کا ایک مکان بنجارہ ہلز میں بھی ہے۔ مغل پورہ میں ان کی دیوڑھی "واجد منزل" پرانے شہر کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا

کرلیا تھی جس میں مختلف اردو انجمنوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً جلسے اور مشاعرے ہوا کرتے تھے میں نے بھی وہاں کئی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کی ہے سیاست کے سینیئر رب ایڈیٹر جناب ذہانت علی بیگ کی کاوشوں سے منعقدہ ایک یادگار مشاعرہ مجھے یاد ہے جس میں ممتاز شاعر جاں نثار اختر نے بھی شرکت کی تھی اس مشاعرہ میں شہر کے نمائندہ شاعروں نے کلام سنایا تھا۔ میں نے بھی اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت کی تھی کئی برسوں تک نواب صاحب کی عنایت سے ان کے دولت خانے پر اردو کے جلسے اور مشاعرے ہوتے رہے۔ کبھی کبھی سٹی پیس کمیٹی کے جنرل سکریٹری غلام صادق الدین مختلف نوعیت کے جلسے منعقد کرتے ہیں مشاعرہ کا بھی اہتمام رہتا ہے غلام صادق الدین کی ذہنی تربیت میں نواب صاحب کی سرپرستی کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔
نواب صاحب کی سرپرستی اور شخصی دلچسپی سے ہی غلام صادق الدین نے گولکنڈہ میں اردو ماڈل اسکول قائم کیا الحمداللہ اسکول آج گولکنڈہ کے مدارس میں اپنی انفرادیت کے ساتھ شہرت رکھتا ہے عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب بھی اس اسکول کی ترقی کے لیے دلچسپی لیتے تھے۔
اسکول کی بعض تقاریب میں بھی ان محترم شخصیتوں نے شرکت کی ہے نواب صاحب کے زیر سرپرستی پروان چڑھنے والے اور بھی لوگ ہوں گے لیکن جہاں تک میں واقف ہوں ان تمام میں غلام صادق الدین صاحب کو اولیت حاصل ہے۔
نواب صاحب پابند صوم وصلوٰۃ، نیک صفت، بامروت، ہمدرد، اعلیٰ کردار کے حامل انسان تھے نہایت منکسر المزاج شریف النفس، محبت شناس، اعلیٰ ظرف تھے

وضع داری کی روشن علامت تھے اُن کی ساری زندگی شفاف آئینہ کی طرح
گزری۔ بے شمار رفاہی کام کیئے۔ بے شمار غریبوں، حاجت مندوں کی مدد کی۔
زندگی بھر اصول پسند رہے کسی بھی شخص کا دل نہیں دُکھایا۔ نیکیاں تقسیم کرتے
رہے۔ بے حد پاک باز، اعلیٰ درجہ کے انسان تھے نہایت سادہ زندگی
گزارتے تھے نہایت سیدھی سادی سی پوشاک رہتی تھی میں نے ہمیشہ انھیں
شیروانی زیب تن کرتے دیکھا ہے اگرچہ وہ پکے کانگریسی تھے لیکن دوسری
سیاسی جماعتوں کی مخالفت نہیں کرتے تھے تمام سیاسی جماعتوں میں انھیں
قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ نواب صاحب کو اُردو شاعری سے بے حد
لگاؤ تھا میں اپنے ابتدائی شعری مجموعوں کی رسم اجراء تقریب کے موقع پر انہیں
زحمت دیتا رہا وہ بہ خوشی تشریف لاتے تھے انہیں اُردو زبان، اُردو
تہذیب سے والہانہ دلبستگی تھی۔ جن لوگوں کی شخصیت پر شرافت کی
مہر لگائی جاتی ہے ان میں نواب میر احمد علی خان صاحب بھی تھے۔

بھارت چند کھنہ

(سکریٹری اُردو اسوسی ایشن کے پہلے صدر منفرد مزاح نگار)

جناب بھارت چند کھنہ نے میرے کہنے پر بے شمار نوجوانوں کے پاسپورٹ فارم کی تصدیق کی جن کی وجہ سے کئی مسلم نوجوان بآسانی پاسپورٹ حاصل کرکے جو آج خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ، شکاگو کناڈا، لندن اور دیگر ممالک میں اچھی اچھی خدمات پر فائز ہیں اُس زمانے میں پاسپورٹ بنانے کے لئے ڈپٹی سکریٹری سطح کے آفیسر کی پاسپورٹ فارم پر دستخط ضروری تھی (آج بھی ضروری ہے) ایک مرتبہ یوں ہوا کہ میرے ایک رشتے دار کا لڑکا پاسپورٹ فارم پر تصدیق کے لئے میرے پاس آیا کھنہ صاحب اُن دنوں سکریٹری گورنر آندھرا پردیش تھے میں نے کھنہ صاحب کے پاس وزیٹنگ کارڈ بھیجا انہوں نے مجھے فوری بلوایا چائے پلوائی میں تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان باہر بیٹھا ہوا ہے آپ کہیں تو استفسار کے لئے بلالوں۔ کھنہ صاحب نے کہا کہ میرے لئے یہی کافی ہے کہ آپ لائے ہیں اُنکے اس پُر اعتماد جواب نے مجھے ہمیشہ کیلئے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔ کھنہ صاحب سیدھے سادے، نیک سیرت اور وضع دار ہونے کے علاوہ حیدرآبادی تہذیب کا مکمل نمونہ ہیں وہ پاسپورٹ فارم ہو یا کوئی دستاویز بلا تامل دستخط کیا کرتے تھے صدر سکریٹری اُردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی مجھے اُن کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا وہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے بھی اُردو ادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

(ماخوذ "سلسلہ پھولوں کا ۱۹۹۲ء)

تاج قریشی

(معتبر استادِ سخن۔ وضع دار شخصیت)

معاشرہ میں کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا ایک ایک پل تہذیبِ گذشتہ کا مکمل آئینہ دار رہا ہو۔ کون ایسے لوگ ہوں گے جو ہر موسم میں ہر حال میں خوش رہے ہوں اور کسی صورت میں بھی اپنی وضع داری کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے ہوں۔ بہت کم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ ایک ہی انداز اور ایک ہی روش پر قائم رہتے ہیں۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسے حالات سے بھی انسان کو گزرنا پڑتا ہے جو اس کے لیے صبر آزما بھی ہوتے ہیں اور الجھنوں کا باعث بھی بنتے ہیں۔ اصول پسند، دیانت دار اور ایماندار لوگ ہر حال میں خوش رہتے ہوئے اپنی زندگی کے خد و خال کو سنوارتے رہتے ہیں پرانے شہر کے ایک معتبر استادِ سخن حضرت تاج قریشی کو جب کبھی میں نے دیکھا ہے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں وہ ایک مستقل مزاج شرافت نواز، باوقار اور معتبر شخصیت کی حیثیت سے میرے مشاہدہ کے

آئینہ دار رہے ہیں حضرت تاج قریشی کی سکونت مغل پورہ میں تھی۔ میں نے پہلی بار حضرت تاج قریشی کو اپنے محترم استاد علامہ قدر عریضی کے دولت خانے پر محفلِ مشاعرہ میں دیکھا تھا مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ کسی اور مشاعرے میں بھی میں نے انہیں دیکھا ہوگا۔ حضرت تاج قریشی درمیانی قد کے نحیف الجسم پُر وقار شخصیت کے حامل تھے بہت ہی قیمتی شیروانی زیبِ تن کیے ہوئے رہتے تھے ان کے ہم عصر شاعروں میں علامہ نجم آفندی، حیدر یار شاہ، مولانا کامل شطاری، علامہ قدر عریضی، احمد علی شاب، سیف حموی، اور خیالی صاحب وغیرہ تھے میں نے اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں بہت سے مشاعرے پڑھے ہیں اُس دور کے ہر اہم مشاعرہ میں حضرت تاج قریشی بھی موجود رہتے تھے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میرے استاد حضرت قدر عریضی اور حضرت تاج قریشی آپس میں بہت قریبی دوست تھے تاج قریشی صاحب ہوں کہ علامہ قدر عریضی یا کوئی اور محترم شاعر ہوں ان شاعروں میں کبھی بھی شاعرانہ چشمک نہیں رہی۔ حالانکہ مشاعروں میں شاعرانہ چشمک کی روایت رہی ہے۔ میں نے ان تمام اساتذۂ سخن کو پُر خلوص انداز میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے مشاعروں کی روایت کچھ ایسی تھی کہ جب اساتذۂ سخن محفلِ مشاعرہ میں داخل ہوتے تو نہ صرف اُن کے ہم رتبہ شاعر ہی کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کرتے تھے بلکہ دیگر اساتذہ کے شاگرد اور تمام شعراء بھی تعظیماً اپنی نشست سے اُٹھ جاتے اور اُن کے بیٹھ جانے کے بعد بیٹھ جاتے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوتا تو نئے شاعروں کو پہلے

پڑھا جاتا تھا۔ اس دور میں عموماً طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے ۔ ایک
طرف علامہ نجم آفندی کے شاگرد ہوتے تو دوسری طرف علامہ قدر عریضی کے شاگرد
ایک طرف مولانا کامل کے شاگرد رہتے تو دوسری طرف حضرت تاج قریشی کے۔
یہ سب ایک ساتھ بیٹھے رہتے تھے حضرت تاج قریشی کی شاعرانہ عظمت کا کھلے
دل کے ساتھ اعتراف کیا جاتا تھا ان کے اشعار پر کھل کر داد دی جاتی تھی مشاعرہ
شروع ہونے سے قبل میزبانِ محفل تمام شرکائے محفل کے لیے چائے کا انتظام کرتے
تھے کبھی کبھی مشاعرہ کے اختتام کے بعد بھی چائے سے تواضع کی جاتی تھی حضرت تاج
قریشی تحت میں کلام سناتے تھے کلام سنانے کا انداز شرکائے محفل کو متوجہ کرتا تھا
نہایت خاموش طبع، صاف دل، صاحبِ ضمیر انسان تھے جونیئر شاعروں کی حوصلہ
افزائی میں بخالت سے کام نہیں لیتے تھے تاج صاحب نے اپنی وضع داری کو
آخری سانس تک باقی رکھا۔ حضرت تاج قریشی کے دولت خانے پر مجھے دو تین
مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں سیاست اخبار میں شعراء کا تعارفی
سلسلہ سیاست فیچر کے زیرِ عنوان شروع کیا گیا تھا۔ میں اس کالم کا مرتب تھا
اس کالم میں محمد قلی قطب شاہ سے لے کر رئیس اختر تک میں نے ۱۲۴ شاعروں
پر نمونۂ کلام کے ساتھ تعارفی مضامین لکھے۔ تاج قریشی صاحب سے میں نے اپنے مضمون
کی تکمیل کے سلسلے میں ملاقات کی تھی اور مطلوبہ مواد اُن سے حاصل کر لیا تھا جو میرے
مضمون کے لیے ضروری تھا ابتدا میں فی الفور میری خواہش کی پذیرائی
نہیں ہوتی۔ بعض اساتذۂ کرام ایسے بھی رہے ہیں جو اپنے بارے میں اپنی
تشہیر کے بارے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے لیکن میں نے تاج قریشی صاحب سے

ایک دو ملاقاتوں میں ان کا منتخب کلام اور حالاتِ زندگی حاصل کر ہی لیا اس طرح ایک کالم کا تعارفی مضمون نمونۂ کلام کے ساتھ شائع ہوا۔ اس دور کے تمام اساتذۂ سخن کے علاوہ مشہور و معروف شاعروں پر بھی مضامین شائع ہو چکے ہیں سیاست میں یہ تعارفی سلسلہ تقریباً ۳ سال تک چلتا رہا سیاست اخبار میں اس طرح کے ادبی سلسلے شائع ہوتے رہے۔ حضرت تاج قریشی کے بھی بعض شاگرد مقابلۂ شعر و سخن میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اچھے اشعار کے کالم کے لیے بھی شعر بھیجتے تھے تاج قریشی اپنے دور کی ایک وضع دار شخصیت تھے ان کے سب سے زیادہ مشہور و معروف شاگردوں میں شاغل ادیب کا نام لیا جاتا ہے جن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف شعر و ادب کی محفلوں اور علمی و تہذیبی حلقوں میں کیا جاتا ہے شاغل ادیب ۱۶ کتابوں کے مصنف و مولف ہیں زائد از پچاس برسوں سے علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں ادھر کچھ برسوں سے ان کا اوڑھنا بچھونا شعر و ادب ہو گیا ہے۔ تاج قریشی کا نام محمد تاج الدین تھا ۲۲ رجب ۱۲۸۹ھ کو پیدا ہوئے اور ۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو انتقال ہوا۔ ان کے والد کا نام

تاج قریشی کا نام محمد تاج الدین تھا۔ ان کے والد کا نام محمد بدرالدین تھا تاج الدین صاحب ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد محترم حیات تمام افسر میں تعلقہ افسر تھے ان کی پرورش جاگیردارانہ تو آ ماحول میں ہوئی۔ مولانا مظفر حسین اور حضرت عبداللہ شاہ سے ابتدا میں عربی تعلیم حاصل کی میر دلاور علی تاثی ان کے تاریخی استاد تھے نشی رگھوناتھ دور سے اردو کی تعلیم حاصل کی ۱۴ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے ابتداء میں دلاور علی تاثی اور رضا علی تاریخی ادب کو کلام دکھاتے رہے آخر میں باقاعدہ اور مستقلاً سید علی ترک کو اپنا کلام دکھایا۔

سید علی زیرک کو اپنا کلام دکھایا۔ تاج قریشی صاحب نے تقریباً تمام اصناف
سخن میں شعر کہے ہیں۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام سوزِ دردِ دل ممتاز شاعر شاغل
ادیب نے ترتیب دیا ہے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔
اُس دور کے اساتذۂ کرام پرانے شہر کے مشاعروں ہی میں شرکت کیا کرتے تھے
عام مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ میں نے اپنی شعری و ادبی
زندگی میں تاج قریشی صاحب کو نئے شہر کے کسی ایک مشاعرہ میں بھی نہیں دیکھا۔
میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان اساتذۂ کرام کے شاگردوں نے ایک دوسرے سے
ٹکراؤ کا کبھی ماحول پیدا نہیں کیا بلکہ ایک استاد کے شاگرد دوسرے استاد شاعر
کے شاگردوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ استادی و شاگردی کا وہ مفید
سلسلہ ختم ہوتا چلا گیا۔ ہمارے اساتذۂ کرام کو اپنے کلام کی اشاعت سے بہت کم
دلچسپی رہتی تھی۔ اخباروں میں شاید ہی کلام چھپتا رہا ہو۔ شعری مجموعے بھی بہت
کم اساتذۂ سخن کے شائع ہوتے اگر شائع بھی ہوتے تو بہت تاخیر سے۔ ویسے
علامہ نجم آفندی، حضرت کامل شطاری اور حضرت قدر عریضی، احمد علی شاب کے
شعری مجموعے میری نظر سے گزر چکے ہیں اور اگر دیگر اساتذۂ سخن کے بھی مجموعے
منظرِ عام پر آچکے ہیں تو وہ میرے علم میں نہیں ہیں۔ میں اپنی ذاتی معلومات کو ہی
اپنی تحریروں میں جگہ دیتا ہوں تاکہ کوئی میری تحریروں پر حرف زنی نہ کر سکے۔
اُس دور کے پرانے شہر کے مشاعروں میں ملک الشعراء اوج یعقوبی، سعید شہیدی،
خواجہ شوق، خیرات ندیم، طالب رزاقی، ابن احمد تاب، منوہر لال شارب،
تابش صدیقی، منوہر لال بہار، ریورنڈ ہینسن ریحانی یہاں موجود رہتے تھے۔

اس دور میں میرے شہر کے شعرا مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، سید ابن ارب کنول پرشاد کنول وغیرہ بہت کم پرانے شہر کے کسی مشاعرہ میں شرکت کرتے تھے البتہ علامہ حیرت بدایونی کو میں نے حضرت قدر عریضی اور مولانا کامل شطاری کے مشاعروں میں کبھی کبھی شرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے حضرت تاج قریشی کے ہم عصر و ہم رتبہ شعراء کے بعد اوج یعقوبی اور ان کے شعراء کی زیر سرپرستی پرانے شہر کے مشاعروں میں رونق بڑھنے لگی۔ آج بھی ہمارے شہر میں پچھلی روایتوں کا تسلسل جاری ہے استادی شاگردی کا سلسلہ بھی برقرار ہے اس سلسلے میں علی احمد جلیلی اور حضرت خواجہ شوق کے نام زیادہ اہمیت کے حامل ہیں مشاعرے آج بھی ہو رہے ہیں آئندہ بھی ہوتے رہیں گے ہمارے شہر کا ادبی ماحول اور ادبی و تہذیبی روایات اس بات کے متقاضی ہیں کہ مشاعروں کا یہ سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔ شہر میں بہت سی شعری و ادبی انجمنیں موجود ہیں جو اپنے اپنے انداز سے کام کر رہی ہیں حضرت تاج قریشی اگرچہ کم آمیز شاعر رہے لیکن آج بھی معیاری ادبی محفلوں میں ان کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کاش مشاعروں کا وہی رنگ ہوتا آداب محفل کا اسی طرح خیال رکھا جاتا۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا

غلامِ احمد

(سکریٹریٹ کے بے تاج بادشاہ۔ نامور کرکیٹر)

غلام احمد صاحب سکریٹریٹ کے اُن خوش مزاج، خوش اخلاق اور دلنواز عہدہ داروں میں سے ایک تھے جنھوں نہ جانے کتنے مستحق نوجوانوں کے تقررات اور پریشان حال ملازمین کے تبادلوں کی منسوخی کے علاوہ بیشتر سرکاری اور غیر سرکاری امور میں بھی بھرپور تعاون کیا تھا۔ میں جب بھی اُن سے ملنے جاتا انتہائی خلوص کے ساتھ پیش آتے۔ سگریٹ پیش کرتے، چائے نوشی ہوتی اور کہتے بولو کیسے آنا ہوا؟ غلام احمد صاحب کا اجلاس ایک شاہی دربار جیسا تھا مگر فقیرانہ رنگ لئے ہوتا۔ ہر قسم کے ضرورت مند اصحاب کے علاوہ دوست احباب کی آمد کا سلسلہ دفتر کے شروع ہونے سے ختم ہونے تک جاری رہتا۔ ہر شخص کی مدد کرتے۔ ایسا یار باش عہدیدار سکریٹریٹ کو پھر نصیب نہ ہوسکے گا۔ سفارش کرنے کے معاملے میں وہ بہت سخی واقع ہوئے تھے۔ کوئی شخص اُن کے قلندرانہ دربار سے خالی نہیں لوٹتا۔ صدر سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

(ماخوذ ”سلسلہ پھولوں کا ۱۹۹۴ء“)

سید مکثر شاہ

(پُرخلوص۔ سادہ مزاج۔ بے حد شریف انسان)

دنیا میں کتنے ہی لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں یہ سلسلہ تو حضرت آدمؑ کے زمانے سے ہی جاری ہے لیکن بہت سے لوگوں میں کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی نیکی، شرافت و نجابت، حسن سلوک و اعلیٰ کردار کی بہ دولت انسانی و تہذیبی رشتوں کی پاسداری کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں کچھ ہی لوگ یادگار زمانہ ہوا کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان اپنی سوسائٹی اور اپنے معاشرے اور اپنے ماحول میں نمایاں حیثیت سے اپنی پہچان کے ساتھ باقی رہتا ہے تو یقیناً کوئی کارنامہ انجام دیتا ہوگا۔ جو عام طور پر دوسرے لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ کارناموں کے بھی مختلف انداز ہوتے ہیں۔ کوئی شخص علمی تو ادبی کارنامے انجام دیتا ہے تو کوئی تہذیبی و ثقافتی، کوئی تعلیمی و فلاحی تو کوئی سیاسی اور کوئی انسانیت کے ناتے پہچانا جاتا ہے ... ان

بیشتر لوگوں میں سے بھی جو مختلف نوع زمروں میں رہ کر سرسبز و شاداب زندگی گزارتے ہیں ان کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے اچھے لوگوں کی پہچان آسان ضرور ہے لیکن اچھے لوگوں میں سے زیادہ اچھے لوگوں کی شناخت کے لیے ذہانت و فطانت، باریک بینی اور گہری نظر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس طرح سوسائٹی میں تین زمروں میں انسان کو بانٹا جاتا ہے خوب، خوب تر، خوب ترین۔ حقیقتاً تو یہ ہے کہ برے لوگوں کی وجہ سے اچھے لوگوں کی پہچان بن جاتی ہے بدی کا جب تک وجود باقی رہے گا نیکی کی اہمیت بڑھتی جائے گی اس طرح رات کے بعد سویرا، اندھیرے کے بعد اُجالا ضروری ہے اسی طرح بدی کے ساتھ نیکی کا وجود، بہترین زندگی کے لیے لازمی سمجھا جاتا ہے پاک و صاف ماحول میں سانس لینے والے لوگوں کی منتخب فہرست میں ہم سید مکرم شاہ صاحب کو بہ آسانی شامل کر سکتے ہیں۔ مکرم شاہ کے دور میں بہت سے منتخب لوگ رہے ہیں لیکن ہر ایک کی بات اُس کے ساتھ رہتی ہے کوئی شخص اپنی شرافت سے متاثر کرتا ہے تو کوئی اپنے رکھ رکھاؤ سے کوئی اپنے انداز گفتگو سے تو کوئی اپنے طرز حیات سے، کوئی اپنی وضع داری سے تو کوئی اپنی طرح داری سے۔ میں نے مکرم شاہ صاحب کو ہر اعتبار سے منتخب شخصیتوں میں پایا۔ سید مکرم شاہ کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ کوئی بھی اُن سے پہلی ملاقات کے بعد اُن کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ آج بھی ہمارے شہر میں بہت سے لوگ موجود ہیں جو مکرم شاہ کی خوشگوار یادوں کے چراغ

جلائے ہوئے ہیں۔ ایسی یادیں جو دل و دماغ کو مسخر کر لیتی ہیں وہ زندگی کا ایک اہم حصہ بنی ہوئی رہتی ہیں۔ مکرم شاہ صاحب کو یاد کرنے والوں کی یقیناً بہت بڑی تعداد ہوگی۔ مکرم شاہ صاحب ایک ایسے انسان تھے جن کا ہر عمل، جن کی ہر حرکت انسانی رشتوں کی امین رہا کرتی تھی نہایت پاک وصاف، نکھری ستھری ذہنیت رکھنے والے کشادہ دل و دماغ کے مالک تھے مکرم شاہ صاحب کو اردو زبان اور اردو شاعری سے بے حد دلچسپی تھی شہر میں ہونے والے تقریباً تمام کل ہند مشاعروں میں کبھی صدر تو کبھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کیا کرتے تھے مشاعروں میں مکرم شاہ صاحب کی تقریر نہایت مختصر مگر جامع ہوتی تھی شاہ صاحب حیدرآبادی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتے تھے وضعداری ان کی نس نس میں رچ بس گئی تھی غیر معمولی شریف انسان تھے یہاں تک مجھے یاد ہے مکرم شاہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ۳۰، ۳۲ برس پہلے اولڈ ایم ایل اے کوارٹر حمایت نگر میں ہوئی تھی وہ مجھے ترمل میں ہونے والے کسی بڑے مشاعرہ میں مدعو کرنا چاہتے تھے انہوں نے سیاست آفس کو فون کر کے مجھے بلوایا تھا میں وقت مقررہ پر پہونچا۔ نہایت خلوص و محبت کے ساتھ مجھ سے ملے۔ اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ دورانِ گفتگو مجھ سے کہا کہ آپ میرے پسندیدہ شاعر ہیں آپ کی شاعری ہی نہیں آپ کے ترنم سے بھی میں بے حد متاثر ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حیدرآباد میں مجھے دو ہی شاعر زیادہ پسند ہیں ایک آپ اور دوسرے خیرات ندیم۔ میں نے کہا حیدرآباد

بیں بہت سے اچھے شاعر ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا کہ میں اپنی پسند کو کیا کروں۔ اس پہلی ملاقات میں مکتر شاہ صاحب نے اپنی دلبستگی کے ایسے نمایاں نقوش چھوڑے کہ میں ان کی شرافتِ نفس، شائستگیٔ مزاج اور اُن کے حسنِ سلوک کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ مشاعرہ غالباً انجمن ترقی اُردو نرمل کی جانب سے آراستہ کیا گیا تھا مشاعرہ گاہ میں تل دھرنے جگہ نہیں تھی شاندار و یادگار مشاعرہ ہوا ایم ایل اے کوارٹر کی اُس ملاقات کے دوران مکتر شاہ صاحب نے خیراتِ ندیم اور میرے زادِ راہ کا انتظام کیا۔ مشاعرہ کے بعد مکتر شاہ صاحب نے اپنی کار میں ہمیں حیدر آباد بھیجوایا۔ مکتر شاہ صاحب پہلے ایم ایل سی ہوئے پھر صدر نشین قانون ساز کونسل مقرر ہوئے۔ اپنی صدر نشینی کے زمانے میں شاہ صاحب نے بھرپور اُردو زبان کے حل طلب مسائل کے لیے نمائندگی کی۔ ان کے کارناموں کی ایک لمبی فہرست ہے نرمل میں ان کے رفیق دیرینہ پی نرسا ریڈی رہتے تھے نرمل نرسا ریڈی صاحب کا وطن ہے جبکہ مکتر شاہ صاحب کا وطن عادل آباد ہے نرمل ضلع عادل آباد کا ایک تعلقہ ہے نرمل کا ایک اور یادگار مشاعرہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا اُس مشاعرہ میں [illegible] مشاعرہ کی طرح مجھے کچھ زیادہ ہی داد و تحسین سے نوازا گیا مشاعرہ کے دوسرے دور میں مجھے اور ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشاؔ کو یاد بار [illegible] گیا۔ اس مشاعرہ میں اشعار کے ذریعہ شاعرانہ چشمک کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ ہوا یوں کہ منشاء الرحمٰن منشاؔ صاحب نے اپنی ایک غزل کے تمام اشعار

یں یہ بات کہی تھی محفل کے تمام شعراء میں اُن کا سب سے زیادہ اعلیٰ مقا
ہے اور وہ سب سے برتر ہیں جب مجھے دعوتِ سخن دی گئی تو میں نے ان کے اشعار
کے جواب میں اپنے اشعار کے ذریعہ ان کے شاعرانہ رتبہ کی نفی کر دی۔ یہ سلسلہ سوال و
جواب کی شکل اختیار کر گیا لیکن آدابِ محفل کے خلاف کوئی ایسی واضح بات
ظہور پذیر نہیں ہوئی جو محفل کے درہم برہم ہونے کا سبب بن سکے۔ سید مکتر
شاہ شہر کی ایک مذہبی انجمن "انجمن قادریہ" کے سرپرستِ اعلیٰ تھے اس انجمن
کے ایک سربراہ سید محمد قادری بھی تھے جو سکریٹریٹ میں میرے ساتھی تھے۔ ہم
دونوں محکمہ پنچایت راج میں بہ حیثیت سکشن آفیسر کام کرتے تھے ان کی شخصی دلچسپی
سے میں انجمن قادریہ سے سالانہ نعتیہ مشاعرہ میں شرکت کرتا تھا ایک مشاعرہ مجھے
یاد ہے کہ جس میں سید مکتر شاہ کے علاوہ عزیز سیٹھ وزیر کرناٹک اسٹیٹ
بھی موجود تھے جس میں میں نے نعت سنائی تو بہت پسند کی گئی نعت شریف کا
یہ شعر ۔ آنکھوں میں ہے حسرتِ دیدارِ محمد
میں کب سے مدینہ کی طرف دیکھ رہا ہوں
اس قدر پسند کیا گیا کہ مجھے تقریباً ۶ سے زائد مرتبہ دوہرانا پڑا۔ ویسے بھی ترنم
سے شعر مزید پُر اثر ہوتا ہے مجھے دوست تخصیص اب بھی کہتے ہیں کہ
نعت کے مقابلے میں میرا ترنم بہت زیادہ پُر اثر ہوتا ہے۔ سید مکتر شاہ
صاحب جب میرے کلام سے متاثر ہونے لگے تو میں انہیں اپنے زیرِ انتظام ہونے
والی اہم ادبی تقاریب میں مدعو کرنا شروع کیا میرے شعری مجموعوں کی رسمِ اجراء
تقریب میں میں نے ہمیشہ انہیں شرکت کی زحمت دی ہے کبھی انہوں نے رسمِ اجرا

انجام دی، کبھی صدارت کی اور کبھی وہ مہمانِ خصوصی رہے جب این ٹی راماراؤ نے تلگو دیشم پارٹی تشکیل دی اور وہ کانگریس آئی کو شکست دے کر ریاست آندھرا پردیش کے چیف منسٹر بنے تو انہوں نے حیدرآباد کی تہذیب کی اعلیٰ روایات کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ حیدرآباد کے بعض سیاسی و غیر سیاسی ممتاز شخصیتوں کے علاوہ بعض مہذب شہری این ٹی راماراؤ کے منفی ذہن کی مذمت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ این ٹی راماراؤ کی یہ عادت تھی کہ ہر اہم شخص کو علی الصبح ناشتہ پر مدعو کرتے تھے ایک دفعہ انہوں نے سید مکرم شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا۔ دورانِ گفتگو راماراؤ کے ذہن پر جو حیدرآبادیوں کے بارے میں، حیدرآبادیوں کے اسلاف کے کارناموں اور ان کی اعلیٰ اقدار کے سلسلے میں عدم واقفیت کی گرد جمی ہوئی تھی اس کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ بتدریج راماراؤ اعتدال پسند ہونے گئے۔ مکرم شاہ نے مجھ کو راماراؤ سے اپنے مراسم کے بارے میں ایک اہم بات بتائی۔ ہوا یوں کہ پارکس میں اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کی جانب سے افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا مکرم شاہ بھی اس افطار پارٹی میں مدعو تھے۔ مجھے جناب محبوب حسین جگر صاحب نے سیاست کے لیے رپورٹنگ کے لیے بھیجوایا تھا افطار پارٹی کے بعد میں واپس ہونے والا تھا تو مکرم شاہ صاحب نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ کار میں بیٹھئے میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ ان دنوں میں سید علی چبوترہ (شاہ علی بنڈہ) میں رہتا تھا مکرم شاہ صاحب نے این ٹی راماراؤ کے اکھڑے ہوئے غیر سنجیدہ رویوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ

راماراؤ حیدرآباد کی تہذیبی روایات سے ناواقف ہیں انہیں واقف کرانے کی ضرورت ہے چنانچہ کہہ رہے تھے کہ این ٹی راماراؤ نے اُن سے ایک دفعہ کہا تھا کہ حیدرآباد میں آپ پہلے مسلمان ہیں جن کی میں سب سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔ راماراؤ نے نہ صرف مکرم شاہ صاحب کو اہمیت دی بلکہ ان کی شرافت کے قائل ہو گئے۔ ویسے بعد میں این ٹی راماراؤ نے جناب عابد علی خان صاحب سے بھی اپنے روابط بڑھائے اور وہ یہاں کے ماحول میں گھل مل جانے کی کوشش کرتے رہے۔ این ٹی راماراؤ اپنے چیف منسٹری کے دور میں اس قدر آپے سے باہر ہو گئے تھے کہ وہ مرکز سے ٹکرانے لگے۔ مرکز کی کانگریسی حکومت پر سخت تنقید کیا کرتے تھے اور وہ اپنے آپ کو ملک کا بہت بڑا قائد سمجھنے لگے یعنی ان کا لب ولہجہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ حکومت ہند کے وزیراعظم ہیں۔ این ٹی راماراؤ کے بعض غلط فیصلوں کے سبب میں نے بہت سے جارحانہ شعر کہے ہیں۔ شنکرجی میموریل سوسائٹی کے ایک کل ہند مشاعرہ میں این ٹی راماراؤ نے بھی شرکت کی تھی۔ میں نے اُس وقت این ٹی راماراؤ کے لیے خاص طور پر جو غزل کہی تھی اور مشاعرہ میں سنائی تھی اس کے دو شعر یہ ہیں ؎ اعلیٰ ظرفوں کی جگہ کم ظرف جب پانے لگے

اپنا آنگن چھوڑ کر مرکز سے ٹکرانے لگے

خود فریبی کا ذرا یہ بھی تماشہ دیکھئے
کیسے کیسے لوگ اپنا اوتار کہلانے لگے

مشاعرہ میں ہلچل مچ گئی۔ مشاعرہ کی فضاء گرم ہو گئی۔

غالباً این ٹی راما راؤ ان اشعار کا مطلب سمجھنا چاہتے تھے مکرم شاہ صاحب اُن کے بازو ہی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے لپٹے رندا نہ سے سمجھایا (یعنی) چار مانہ اشعار کا دوسرا ہی مطلب سمجھایا) مکرم شاہ مجھ پر بڑے مہربان تھے میری شاعری کے قدرشناس تھے جب کبھی ملاقات ہوتی اپنی پوری شرافت کے ساتھ گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے تھے مجلس قانون ساز کے صدرنشین بنے تو اُن کی رہائش گاہ لکڑی کے پل پر آن سے ملاقات ہوتی تھی۔ میری ملاقات صرف ادبی جلسوں اور مشاعروں کے سلسلے میں ہی ہوا کرتی تھی جب میں اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجتا فوراً بلواتے بلکہ بعض دفعہ وہ خود باہر آکر لپنے ڈرائینگ روم میں لے جاتے۔ جب وہ قانون ساز کونسل کے صدرنشین نہیں رہے تو بھی میں انہیں ادبی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لیئے زحمت دیا کرتا تھا اُس زمانے میں وہ کڈم کا میلکس، نارائن گوڑہ کے ایک فلائیٹ میں رہتے تھے۔ آخری دم تک کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے۔ جناب عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہر دور میں سید مکرم شاہ صاحب جیسے انسانیت نواز، شریف النفس اور مخلص لوگ معاشرہ میں خال خال رہے ہیں۔

عظمت عبدالقیوم

(حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ خاتون ممتاز شاعرہ و ادیبہ)

حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ خاتون عظمت عبدالقیوم میری منہ بولی بہنوں میں سے ایک بڑی بہن تھیں۔ وہ مسلم معاشرہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھیں ۔ ہر شخص کی زندگی میں بعض ایسی شخصیتیں بھی آتی ہیں جو نہایت خاموشی سے اپنے گہرے تاثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ عظمت آپا کی شخصیت ایک عجیب نورانی کیفیات کی حامل تھی ہمارے معاشرے کا کیسی ہی قدر آور شخصیت کیوں نہ ہو، وہ اس پُر وقار شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اُن کی عزت و احترام کرنا جیسے ایک لازمی فریضہ تھا ایسا احساس ہر اُس شخص کا ہوتا تھا جو اُن سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ اُن کے چہرہ پر اس قدر نور تھا کہ گمان ہوتا کہ یہ ایک نورانی مخلوق ہیں۔ شخصیت کی جاذبیت اور پُر جمال چہرہ اُن کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ نرم گفتاری، شائستہ روی، شگفتہ مزاجی، طبیعت کی سنجیدگی یہ تمام خصوصیات ایک

شخصیت میں ضم ہو گئی تھیں۔ عظمت آپا نے مجھے اپنے چھوٹے بھائی جیسا پیار دیا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھا۔ وہ میری ہر بات سنجیدگی اور توجہ سے سنا کرتیں اور عمدگی اور نرمی سے جواب دیتی تھیں۔ محفلِ خواتین کے قیام کے بعد مجھے عظمت آپا سے ملنے کا زیادہ موقع ملنے لگا۔ محفلِ خواتین کے ہر چھوٹے بڑے کام سے متعلق مجھ سے وہ لازماً مشورہ کیا کرتی تھیں۔ عظمت آپا کے شوہر محترم عبدالقیوم خان صاحب چیف انجینئر P.W.D. مجھے بے حد چاہتے تھے۔ اُن کا مسکراتا ہوا پُروقار چہرہ مجھے ہمیشہ متاثر کرتا رہا۔ مشاعرے ہوں کہ محفلِ خواتین کے اجلاس اُن کی چہیتی بیٹی شاداں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتی تھی شاداں کو میرا ترنم بہت پسند ہے وہ کہتی ہیں نیر بھائی جب آپ ترنم میں غزل سناتے ہیں تو مجھے رونا آتا ہے بہت درد انگیز ترنم ہے آپ کا۔ عظمت آپا اپنی بیٹی شاداں کو ستانے کے لیے کہتی تھیں کہ ہماری بیٹی کو تو ہمارا کلام پسند ہی نہیں۔ اُسے تو بس نیر بھائی کا کلام پسند ہے (شاداں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو چھوٹی بہنوں میں ہوتی ہیں)۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں عظمت آپا کا نام سرفہرست آتا ہے۔ عظمت آپا سے میری آخری ملاقات اُن کے انتقال سے ۵ دن پہلے اُن کے مکان "خیابان" پر ہوئی۔ ۲۱ مئی ۱۹۸۸ء کی ابتدائی ساعتوں میں بہ عارضۂ قلب ان کا انتقال ہو گیا۔ گورنر آندھرا پردیش شریمتی کمود بین جوشی عظمت آپا کا بڑا احترام کرتی تھیں ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ عظمت آپا، شاداں اور میں گورنر صاحبہ سے ملنے کے لیے راج بھون گئے

ہوئے تھے جیسے ہی گورنر صاحبہ کو یہ معلوم ہوا کہ عظمت آپا آئی ہوئی ہیں تو وہ عظمت آپا کو لینے کے لیے اپنے چیمبر سے باہر آئیں اور اپنے بازو کرسی پر عزت و احترام سے بٹھائیں اور جب عظمت آپا واپس ہو رہی تھیں تو وہ عظمت آپا کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے موٹر کے قریب تک تشریف لائیں اور انھیں موٹر میں بٹھا کر واپس ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کے لیے راج بھون کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے جس وقت چاہیں بلا روک ٹوک آسکتی ہیں عظمت آپا نے جشن عظمت عبدالقیوم کی پُر اثر تقریب میں میرے بارے میں کہا تھا کہ میں اپنے بھائی صلاح الدین نیر کی محنتوں کا صلہ تو کچھ نہیں دے سکتی البتہ میری دعا ہے کہ نیر کو میری عمر لگ جائے۔ عظمت عبدالقیوم بانی محفل خواتین اور بانی شاداں ایجوکیشنل سوسائٹی کے چار شعری مجموعے زرِ گل، رگِ گل، سفرِ سحر اور عظمتِ وطن شائع ہو چکے ہیں ان کی شاعری پر عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم عبدالوہاب غوری نے ایم فل کیا ہے۔ میں نے جشن عظمت عبدالقیوم کے موقع پر عظمتِ غزل کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے جس میں مشاہیر اردو کے مضامین، عظمت عبدالقیوم کی ادبی خدمات کے سلسلے میں شامل ہیں "خیابانِ عظمت عبدالقیوم" کے نام سے بھی ایک کتاب میں نے مرتب کی ہے جس میں عظمت عبدالقیوم کے مضامین اور ان سے متعلق تحریریں شامل ہیں۔

پھر وہی پرچھائیاں ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

(گلستاں بکھیرنے والی اردو فارسی کی نامور شاعرہ)

برگِ سبز جیسی شاعرہ جب برگِ گل کے اوصاف میں تحلیل ہو کر اپنے فکروفن سے تہذیبِ شعروادب کو مہکانے کا حق ادا کرتی ہے تو ادبی ماحول پر عطر بیز فضا چھا جاتی ہے اور اس کے شعرو نغمات کی کہکشاں آسمانِ فکروخیال پر کچھ اس طرح پھیل جاتی ہے کہ اجالوں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ خیالات کی فراوانی، مشاہدات کی گہرائی اور جذبات کی تروتازگی جب گلستانِ رنگ و بو کے لئے تجزیہ نگاروں جیسی حسن کاری کا منصب ادا کرتی ہے تو فطرت کے وہ تمام گوشے جو جلوہ نمائی کے لئے منتظر تھے ایک ایک کرکے بے نقاب ہو جاتے ہیں اور فطرت کی وہ تمام نیرنگیاں جو اپنے اپنے وقت پر اظہار کا ذریعہ بن جانا چاہتی ہیں ظہور پذیر ہونے لگتی ہیں۔ ایک قلمکار جب اس قسم کی کیفیات سے گزرتا ہے تو اس کے فکرونظر کے دائرے وسیع تر ہونے لگتا

جانتے ہیں۔

اگر کسی صاحبِ ادراک شخص کو ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی انشاء بلند پروازی کا جائزہ لینا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ ان کی جمالیاتی سحر کاری، تجرباتی طرح داری اور مشاہدات کی جگمگاتی ہوئی شمع فروزاں کو بھی پیشِ نظر رکھے۔ فطرت شناسوں کی محفل کا ایک ایک لمحہ دل و دماغ کو نہ صرف روشن رکھتا ہے بلکہ ذہنِ رسا کی ایک ایک شمع کو حیاتِ جاوداں کی بشارت دیتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ایک ایرانی النسل شاعرہ ہونے ہوتے بھی ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں کچھ اس طرح جذب ہوگئی تھیں کہ ان کے جسم و جاں میں ہندوستانی روایات کی وہ ساری خوشبو مہکتی رہتی جو ایک شگفتہ، مہکتے ہوئے گلاب کا وتیرہ ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید بہ یک وقت تین زبانوں اردو، فارسی اور انگریزی کی شاعرہ تھیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں تمام ادبی حلقے رطب اللسان ہیں۔ بانو طاہرہ سعید کی شاعری سیدھے سادے عام فہم الفاظ مانوس غزلیں کا لبادہ اوڑھے ہوئے برسرِ محفل رونق افروز ہوتی رہیں تو ادبی ذوق رکھنے والے سارے سامعین متوجہ ہو جاتے تھے فارسی کی شاعرہ ہونے [illegible] اردو شاعری کی زبان صاف ستھری اور [illegible] ہے۔ ان کے کلام کی برجستگی و بے ساختگی [illegible] سامنے [illegible] سہلِ ممتنع

کا خراج لیئے ہوئے ان کی شاعری کا لب و لہجہ پر اثر ہوتا ہے ان کے اشعار پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اُتنے ہی معنی آفرینی کے جوہر ہوتے رہیں گے مشاہدات و قلبی واردات کا گہرا اثر ان کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے جو موسم گل کی طرح سارے مکتب فکر و خیال کے باذوق حُسن کاروں کو تر و تازگی بخشتا ہے ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے الفاظ ان کے شاعرانہ خیالات کا استقبال کرتے ہوئے اپنے وجود کو وسیع تر مفہوم میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کسی خاص مسلک کی شاعرہ نہیں تھیں۔ جہاں ان کا کلام کلاسکی شعر و ادب کا ترجمان معلوم ہوتا ہے تو وہیں ترقی پسندانہ فکر کا آئینہ دار اور جدید شاعری (جدیدیت نہیں) کا بھی نمونہ ہے یہ شاعرہ اپنی شاعرانہ حیثیت کو کسی مخصوص خانے میں بانٹنے کی قائل نہیں تھیں۔ اپنی روشن خیالی اور زندہ ضمیری کی وجہ سے تمام ادبی تحریکات اور رجحانات سے بہرہ ور ہو چکی تھیں ان کا ادبی و شعری سفر ایک ایسی راہ سے گزر رہا تھا جہاں ہر قسم کے موسم ان کا خیر مقدم کرتے تھے ان کا تخلیقی سفر دہوں تک جاری رہا اور شاعرہ کی حیثیت سے ادب میں اپنا ایک منفرد مقام بنا چکی تھیں۔ بانو طاہرہ سعید ایک خوش مزاج، شائستہ اطوار اور عمدہ طور و طریق کو اپنانے والی شاعرہ تھیں۔ چشم مروت، کشادہ ذہن و فکر کی بھی مالک تھیں۔ اپنے رکھ رکھاؤ میں شائستگی و نفاست کے ہر اُس پہلو کو خراج

پیش کیا کرتی تھیں جو ایک مہذب انسان کا وتیرہ ہوتا ہے روز و شب کے مسائل کو سلیقے سے سر انجام دینے کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔ زندگی کے سارے لمحات کو ان کی پوری پہچان کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنے کا موقع فراہم کرتی تھیں معاشرہ کا ایک اہم حصہ بن کر اپنی فہم و فراست کی روشنی کو دور دور تک پھیلاتی رہتی تھیں۔ بانو طاہرہ سعید کا حیدرآباد کی سینیئر خواتین شعراء میں شمار ہوتا ہے انہیں میں اس زمانے سے ایک شاعرہ کی حیثیت سے جانتا ہوں جب وہ ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور اردو مجلس کی محفلوں میں اپنا کلام سنایا کرتی تھیں۔ یہ بات ۱۹۵۹-۱۹۶۰ء کی ہے۔ شہر میں ہونے والے تمام مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتی تھیں البتہ شہر کے بعض تعلیم یافتہ مہذب گھرانوں میں اگر کوئی مخصوص مشاعرہ ہو تو شریک ہوا کرتی تھیں اور ایسی محفلوں کا زیادہ تر میں ہی معتمدِ مشاعرہ رہا کرتا تھا۔ شاعری کے ابتدائی زمانے میں شہر کے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے بعض اہلِ ذوق اصحاب اپنی رہائش گاہوں پر محفلِ شعر کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ایسی محفلوں میں بھی بانو طاہرہ سعید کی شاعری پوری توجہ کے ساتھ سنی جاتی تھی۔ ان کے اشعار پر دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔ ان کے رفیقِ حیات بریگیڈیر سعید صاحب نہایت شریف النفس، اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مشاعروں میں بانو طاہرہ سعید کو اپنی چھوٹی سی موٹر آسٹن میں لے آتے

اگر میں کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے ڈاکٹر صاحبہ سے فون پر بات کرنا چاہتا تو سعید صاحب فون ریسیو کرتے (بلکہ اکثر دفعہ سعید صاحب ہی فون ریسیو کرتے تھے) اور کہتے طاہرہ! نیّر صاحب کا فون۔ وہ فوراً آتیں اور گفتگو جاری رہتی۔ اسی طرح کی بات عظمت عبدالقیوم کے شوہر محترم عبدالقیوم صاحب (ریٹائرڈ چیف انجینئر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی) کہتے تھے اُن دنوں جتنے بھی خاص خاص مشاعرے ہوتے تھے ان میں شہر کے نمائندہ با ذوق خواتین وحضرات مدعو رہا کرتے تھے۔ خواتین کی تعداد بھی مرد حضرات سے کم نہیں ہوتی تھی۔ شعر و ادب کی محفلوں سے روشناس کرانے کے لئے اُس دور کی خواتین اپنی لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ محفل میں لے آتی تھیں جس طرح عظمت عبدالقیوم کے ہمراہ ان کی بیٹی شاداں رہتیں۔ اسی طرح شہر کی مہذب خواتین بھی تنہا نہیں رہتی تھیں۔ اُس وقت کے مشاعرے ایک خاص ماحول کے نمائندہ ہوا کرتے تھے رفتہ رفتہ ایسی محفلیں کم ہوتی گئیں۔ کبھی کبھی اُن محفلوں کی یاد آتی ہے تو ماضی کے تمام اوراق الٹنے لگ جاتے ہیں جو اپنی روشنی سے دامنِ تہذیب وثقافت کو چمکاتے تھے۔ اُن محفلوں میں کیسے کیسے لوگ آتے تھے اور کیسے کیسے لوگوں سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں (وہ دور ہی ختم ہو گیا) اب وہ بات کہاں۔ یا تو طاہرہ سعید اپنی مخصوص طرزِ معاشرت کی وجہ سے بھی منفرد حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی زندگی قابلِ رشک تھی

حیدرآباد ایک ایسا شہر ہے جس کے دامن میں ہر دور میں رنگ برنگ کے پھول کھلتے اور مہکتے رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بانو طاہرہ سعید کی قیام گاہ پر شعری و ادبی محفلیں مخصوص ہوا کرتی تھیں جن میں شہر کے منتخب شرفاء و شعراء شریک رہا کرتے تھے بریگیڈیر سعید مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے پیش پیش رہتے ہوئے مہمانوں کی پذیرائی میں چشم براہ رہتے تھے مہمانوں کی تواضع میں فراخدلی کا ثبوت دیا جاتا تھا۔ ان کے گھر میں آراستہ کی جانے والی محفلوں میں ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) اور اُن جیسی کچھ اور با وقار شخصیتیں اپنے اہل خاندان کے ساتھ شرکت کیا کرتی تھیں۔ بڑی خوشگوار محفلیں ہوتی تھیں۔ مجھے بانو طاہرہ سعید کی ایک دعوت خاص طور پر یاد ہے جو اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "برگِ سبز" کی رسم اجراء تقریب کے سلسلے میں دی گئی تھی عشائیہ کے بعد مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا انتہائی باذوق ادب دوست خواتین و حضرات کی اُس محفل میں شعر و ادب کے موضوع پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ اس محفل میں حیدرآباد کے ایک مہذب گھرانے سے تعلق رکھنے والی معزز و معتبر خاتون صالحہ الطاف (مدیر خاتونِ دکن) بھی مدعو تھیں (جن کے رسالہ کی رسم اجراء تقریب شاندار پیمانے پر روبندرا بھارتی تھیٹر میں ہونے والی تھی) بانو طاہرہ سعید نے صالحہ الطاف سے یہ کہتے ہوئے تعارف کروایا کہ آپ صلاح الدین نیر ہیں۔ ایک ہونہار ابھرتے ہوئے شاعر ہونے کے علاوہ بہترین انسان

ہیں۔ انہیں شعری ادب سے ہی نہیں نثری ادب سے بھی دلچسپی ہے صحافت سے وابستگی رکھتے ہیں "خاتونِ دکن" کے لئے ان کی خدمات بے حد مفید رہیں گی۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد میں رسالہ "خاتونِ دکن" سے جو (ایک خالص ادبی رسالہ تھا) وابستہ رہا۔ بلا وقفہ یہ پرچہ تقریباً ۱۲ سال تک جاری رہا۔ ہاشم علی اختر صاحب سے کبھی اُسی زمانے سے واقف ہوں۔ میں ہمیشہ اُن کی نظر میں رہا۔ میری بے حد حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری اور پروفیسر عبد القادر سروری بھی میری شعری و ادبی سرگرمیوں کو سراہتے تھے۔

بانو طاہرہ سعید کی زندگی، فنونِ لطیفہ کی خدمت میں گزر رہی رہیں خاتون دوستوں میں حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ خاتون ممتاز شاعرہ عظمت عبد القیوم ان سے بہت قریب تھیں۔ آپس میں یہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ عظمت عبد القیوم کے انتقال کے بعد بانو طاہرہ سعید بہت زیادہ خاموش رہیں۔ انہیں اپنی بہترین شاعرہ دوست کی جدائی کا بڑا صدمہ رہا۔ بانو طاہرہ سعید کی تقریباً تمام تصانیف پر ملک کی اردو اکیڈیمیوں نے انعام سے نوازا ہے۔ ان کا کلام اخبار رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ ریڈیو اور دوردرشن سے بھی ان کا کلام داد و تحسین حاصل کرتا تھا۔

بانو طاہرہ سعید کے فن اور شخصیت پر عثمانیہ یونیورسٹی کی طالبہ اقبال بیگم نے ایم فل کیا ہے انگریزی ادب کی مجموعی خدمات کے

اعتراف ہیں۔ نہیں امریکہ کی عالمی یونیورسٹی (یونیورسٹی) ڈاکٹریٹ کا اعزاز دیا گیا ہے۔ انگریزی کی مختلف انتھالوجی میں کلام اور ان کے حالات شائع ہو چکے ہیں اور ان کی ایک انگریزی نظم دنیا کے بہترین ۵۰۰ انگریزی نظموں کے مقابلہ میں شامل ہے۔ محفل خواتین کی بانیوں میں سے ایک تھیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۴۰ برس پہلے جب محفل خواتین کا قیام عمل میں آیا تھا تو اُس وقت کے مشاورتی اجلاس میں بانو طاہرہ سعید بھی موجود تھیں۔ مجھے بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا میں اُس وقت سے ہی محفل خواتین کا مشیر ہوں۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کا پہلا مجموعہ کلام برگ سبز اور میرا پہلا مجموعہ کلام ''گل تازہ'' ایک ہی سال شائع ہوئے تھے بانو طاہرہ سعید بہت زود گو شاعرہ تھیں بہترین نثر نگار بھی تھیں شعر و ادب سے بے حد محبت کرتی تھیں حیدرآباد کی تہذیبی روایات سے انہیں بے حد لگاؤ تھا اپنے وطن عزیز کی محبت میں سرشار رہ کر حب الوطنی کے موضوع پر بہت ہی عمدہ عمدہ نظمیں کہی ہیں۔

ان کا ادبی سفر آخر تک بھی جاری رہا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تاحیات ان کا قلم چلتا رہے گا۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کے پاس کچھ برسوں سے ادبی محفلیں نہیں ہو رہی تھیں البتہ انہوں نے ممتاز محقق جناب نصیر الدین ہاشمی کی دختر نیک اختر نامور افسانہ نگار و شاعرہ خدیجہ ہاشمی (دختر ہاشمی) جو ۲ برس پہلے پاکستان سے حیدرآباد آئی تھیں کے استقبال میں ایک محفل شعر آراستہ کی تھی اس محفل میں

نمائندہ شاعروں اور خاتون شعراء نے کلام سنایا تھا۔ بلقیس ہاشمی نے بھی اپنا منتخب کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی تھی۔ میں ناظم مشاعرہ تھا۔
میں نے حیدرآباد کی بعض خاتون دیبوں اور شاعرات کی شعری و ادبی صلاحیتوں کو اپنی تحریروں کے ذریعہ خراج پیش کیا ہے لیکن بانو طاہرہ سعید پر میں نے کچھ نہیں لکھا تھا اب مجھے ان کی شاعرانہ قدر و قیمت اور ان کی شخصیت پر لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے

صالحہ الطاف

(مدیرۂ خاتونِ دکن۔ صاحبِ طرز ادیبہ آئینہ صفت آبروئے دکن)

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے اپنی قیام گاہ پر ایک پر تکلف عشائیہ میں کچھ مخصوص شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ بعض ایسی ممتاز شخصیتوں کو بھی مدعو کیا تھا جن سے اُن کے شخصی مراسم تھے۔ مجھے یاد ہے کہ صالحہ الطاف سے میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں بانو طاہرہ سعید، عظمت عبدالقیوم اور روحی علی اصغر (جو پاکستان چلی گئیں) کے پاس بھی مخصوص شعری محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں میری شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی مجھے اس طرح کے تمام گھرانے پسند تھے۔ نہایت شائستہ، معتبر اور پر وقار شاعرہ ہونے کے علاوہ یہ تینوں محترم خواتین اپنے خاندانی پس منظر، رکھ رکھاؤ اور شخصی وقار کی وجہ سے بھی ممتاز تھیں۔ یہ محترم شاعرات مجھے اپنا ایک پسندیدہ شاعر کے علاوہ ایک مہذب انسان بھی سمجھتی تھیں۔ بانو طاہرہ سعید نے صالحہ الطاف سے میرا تعارف اس پُر اعتماد اور پُر خلوص انداز

میں کرایا کہ صالحہ الطاف مجھ سے متاثر ہوئیں اور مجھ سے گھر آنے کی خواہش کی۔ صالحہ الطاف کا "نسائی دکن" منظرِ عام پر آنے والا تھا یا تو طاہرہ سعید نے مشورہ دیا کہ نیر صاحب کا تعاون آپ کے رسالے کے لیے نہایت مفید رہے گا۔ رسم اجرائے تقریب نہایت شاندار پیمانے پر ہوئی۔ اُس وقت کے گورنر آندھرا پردیش نے رسم اجرا انجام دی تھی میرے خیال میں حیدر آباد میں کسی ادبی رسالہ کی تقریب رسم اجرا اس قدر شاندار پیمانے پر منعقد نہیں ہوئی۔ اس محفل میں حیدر آباد کے بہت سے شاعر، ادیب، صحافی اور ممتاز شہری موجود تھے تقریب کے بعد مبارکباد دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں مبارکباد دے کر خدا حافظ کہنے ہی والا تھا کہ صالحہ الطاف نے مجھ سے پھر اپنے گھر آنے کی خواہش کی۔ میں ۳۔۴ دن کے بعد صالحہ الطاف کے مکان واقع مکرجی باؤلی (معبر عالم منڈی) پہونچا۔ صالحہ آپا نے مجھے مکمل اختیار دیا تھا کہ میں پرچہ کو اپنے ڈھنگ سے شائع کروں لیکن مجھے ہمیشہ اُن کا مشورہ اور تعاون حاصل رہتا تھا۔ صالحہ آپا کی والدہ محترمہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں (خدا انہیں جنت نصیب کرے) اس گھرانے نے مجھے پیار، محبت اور بے لوث خلوص سے سرشار کیا۔ اُس گھر کے ماحول نے مجھے اُس بات کا احساس ہی ہونے نہیں دیا کہ میں اس گھر کے لیے ایک اجنبی ہوں۔ صالحہ آپا نے اپنی بے لوث چاہت اور سچے خلوص میں کبھی کمی نہیں کی۔ اُن سے جب کبھی بھی ملتا ہوں تو مجھے شدت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک مہذب، شائستہ خاتون سے مل رہا ہوں جنھوں نے اپنے منہ بولے بھائی کے لیے اپنی ساری محبت، ساری شفقت نچھاور کر دی ہے

معاشرہ میں اُن رشتوں کی زیادہ قدر کی جاتی ہے جو انسانی زندگی میں غیر محسوس طریقے سے مختلف اوقات میں، مختلف انداز اور مختلف روپ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ (کائنات کے سارے کاروبار ایسے ہی نازک رشتوں پر قائم ہیں) میری منہ بولی بہنوں کا خیال ہے کہ میں جب کسی کو زیادہ چاہتا ہوں تو مجھے اُن سے لڑنے میں کچھ زیادہ ہی لطف آتا ہے صالحہ آپا سے کبھی کبھی میں الجھتا رہتا تھا۔ یہ بات گھر کے سبھی لوگ جانتے تھے۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی صالحہ آپا کی محبت اور اُن کے سلوک میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی۔ صالحہ آپا بعد میں میرے علمی و ادبی کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ میری شاعری کی جہاں وہ مداح ہیں وہیں وہ مبصر اور نقاد بھی ہیں۔ میرے پہلے مجموعۂ کلام "گلِ تازہ" کی ترتیب و تزئین کی ساری ذمہ داری صالحہ آپا نے اپنے سر لی تھی ایک ایک غزل کا جائزہ لیا اور مناسب انداز سے مجموعہ ترتیب دیا۔ کتاب کو مزید دیدہ زیب بنانے کے لیے اپنی آرٹسٹ چھوٹی بہن عذرا سعید سے مرقعے بنوائے، مرقعوں کی مناسبت سے مجھ سے شعر کہلوائے۔ بہترین سرورق تیار کروایا اور بہترین گیٹ اپ کے ساتھ گلِ تازہ شائع ہوا۔ وہ ایک اچھی ادیب اور ڈرامہ نگار بھی ہیں ادبی و مذہبی کتابوں کا وسیع مطالعہ ہے ان کا زیادہ وقت ادبی و دینی کتب کے مطالعہ میں گذرتا ہے نہایت بُردبار، سنجیدہ، سلیقہ شعار اور پُر وقار شخصیت کی مالک ہیں میرے تمام شعری مجموعوں کی ترتیب و تزئین میں صالحہ آپا کی مشاورت شامل رہی ہے ــــــ

(اقتباس: پھر وہی پرچھائیاں ۱۹۹۲ء)

معین بزمی

(بہترین نعت گو۔ وضع دار شاعر)

کچھ لوگ فطرتاً اس قدر شریف النفس ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں یہ شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی بھی اپنی زندگی میں بے اعتدالیوں کا شکار رہے ہوں گے۔ ان کا طرزِ گفتگو احباب کے ساتھ، ان کا سلوک "قابلِ رشک حد تک پسندیدہ سمجھا جاتا ہے جب بھی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ سنجیدگی کا پیکر بنے ہوئے رہتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا ہر جملہ مختصر رہتا ہے بہت ممکن ہے وہ اپنے مخصوص احباب سے طویل گفتگو کرتے ہوں۔ ویسے مختصر گفتگو میں بھی توازن رہتا ہے۔ زیادہ بولنے والا شخص دورانِ گفتگو بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جس کی وجہ سے ــــــ اس کا وجود سوالیہ نشان بن جاتا ہے اس لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ کم بولنا چاہیئے مگر سوچ سمجھ کر۔ اگر کوئی بات نپے تلے انداز میں کہی جائے تو وہ پُر اثر بھی ہوتی ہے پسند بھی کی جاتی ہے الفاظ کے استعمال میں لغزش کا امکان کم سے کم رہتا ہے۔ سوسائٹی میں

ایسے لوگ نسبتاً زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں جو کم بولتے ہیں مگر کام کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے شہر کے نامور شاعر معین الدین بزمی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کم بولتے تھے مگران کی گفتگو دانشورانہ ہوتی تھی وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اسی لیے معقول لوگوں میں اپنی زندگی گذارتے تھے بزمی صاحب کا نام معین الدین ہے اور تخلص بزمی ۔ اصل نام احمد معین الدین صدیقی ہے ان کے والد محترم محمد شریف الدین طبیب یونانی تھے بزمی صاحب کا مقام پیدائش حیدرآباد ہے ۷، جنوری ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے اور ۳۱، اگست ۲۰۰۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء میں بی اے اور ۱۹۴۹ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۶، جنوری ۱۹۷۱ء کو سپرنٹنڈنٹ بورڈ آف ریونیو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ معین بزمی کی عمر تقریباً ۸۵ برس کی تھی اس عمر میں بھی کبھی کبھی مشاعروں میں رونق افروز ہوتے تھے۔ میں معین بزمی کو زائد از ۴۰ برس سے جانتا ہوں۔ ان کی شاعرانہ وضع داری نے مجھے بےحد متاثر کیا تھا اکثر مشاعروں میں میں نے ان کے ساتھ اپنا کلام سنایا ہے معین بزمی جہاں غزل کے اچھے شاعر ہیں وہیں وہ عمدہ نعت گو بھی ہیں تعمیر ملت کے سالانہ جلسہ رحمتہ اللعالمین میں کئی برسوں تک نعت شریف سناتے رہے ہیں۔ کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے سالانہ منعقدہ نعتیہ مشاعروں میں بھی مدعو رہتے تھے۔ میں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں انہیں ہر چھوٹی بڑی محفلوں میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے چاہے وہ طرحی مشاعرہ ہو کہ غیر طرحی مشاعرہ وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے بہت پہلے کی بات ہے کہ معین بزمی، ریورینڈ ہینیس ریحانی، تاثیر صدیقی

منوہر لال شارب اور منوہر لال بہار ایک ساتھ مشاعروں میں دکھائی دیتے تھے۔ آپس میں ان لوگوں کی بہت اچھی چھنتی تھی خاص طور پر ناشر صدیقی ان کے قریب ترین دوست سمجھے جاتے تھے معین بزمی نے ہمیشہ ترنم میں کلام سنایا۔ طالب رزاقی، امین احمد تاب کی طرح معین بزمی کا بھی مخصوص ترنم تھا معین بزمی ایک ہی ترنم میں کلام سناتے تھے چاہے کسی بھی بحر میں کیوں نہ شعر ہوں۔ مشاعروں میں کم از کم ۹ شعر سناتے۔ ان کے اشعار نہ صرف بامعنی رہتے بلکہ پُر اثر بھی ہوتے ہیں۔ حیدرآباد میں اساتذۂ سخن علامہ نجم آفندی، حضرت قدر عریضی مولانا کامل شطاری، تاج قریشی ایکے ہم عصر شاعر ہیں۔ بزمی صاحب نے حیدرآباد میں ہی نہیں اضلاع میں بھی بے شمار مشاعرے پڑھے ہیں ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر مشاعرہ میں موجود رہتے تھے۔ بزمی صاحب یار باش، دوست نواز، دوستی پسند انسان تھے اور میرے ساتھی جو میر شاعروں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے میرے ساتھی شعراء میں سب سے زیادہ مجھ سے قربت رکھتے تھے۔ میں خود بھی ان کی شاعرانہ وضع داری، ان کی شرافت سے متاثر رہا۔ معین بزمی کا کلام اخبار سیاست میں شائع ہوتا رہا ہے۔ میں نے سیاست میں سیاست فیچرس کے زیر عنوان شعراء کے تعارفی سلسلے میں معین بزمی کے فن اور شخصیت پر تفصیل مضمون لکھا ہے بزمی صاحب نہ صرف ادارۂ ادبیاتِ اردو کے مشاعروں میں برسوں شریک ہوتے رہے بلکہ انجمن ترقی اردو کے مشاعروں میں بھی اپنا کلام سناتے رہے ہیں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں میں بزمی صاحب کو لازماً مدعو کرتے تھے اضلاع کے مشاعروں

میں بھی اپنا کلام سناتے رہے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں میں بسزی صاحب کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اضلاع کے مشاعروں میں بھی سید شہید کی (حضرات ندیم، طالب رزاقی، ابن احمد تاب کی طرح خوش گو شعرا کی فہرست میں ان کا نام شامل رہتا تھا)۔ انہوں نے اضلاع کے بے شمار مشاعرے پڑھے ہیں۔ بسزی صاحب کا بہت سا کلام موجود ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا تا حال کوئی ایک مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا۔ ایک موقع پر میں نے انہیں مجموعۂ کلام کی اشاعت کے لیئے توجہ دلائی تھی لیکن ان کی تساہلی اور افتادِ طبع نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ میں نے کتاب کی اشاعت کا مشورہ اُس وقت دیا تھا جب "اجالوں کے مسافر" کے زیر عنوان ادارہ "میرا شہر میرے لوگ" کی جانب سے ان کی شاعرانہ عظمت کو خراج پیش کرنے کے لیے ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اگر وہ اپنا مسودۂ شاعری اردو اکیڈمی میں داخل کرتے تو یقیناً اردو اکیڈیمی بہ آسانی ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی منظوری دے دیتی۔ دراصل ہمارے شہر کے بعض شعرائے کرام اپنے کلام کی اشاعت سے کم دلچسپی رکھتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے میسر وسائل سے بھی استفادہ نہیں کرتے۔ وہ اس موقف میں بھی نہیں کہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرسکیں۔ بسزی صاحب کو میں نے ہمیشہ شاعروں کے روایتی لباس شیروانی میں دیکھا ہے خوش لباسی ان کی طبیعت کی نفاست کا پتہ دیتی تھی۔ زندگی کے آخری دنوں میں بسزی صاحب زیادہ تر وقت مسجد اور گھر میں گزارنے لگے اپنے محلے کی مسجد حکیم میر وزیر علی (چندو لعل بارہ دری) کی کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ یعنی بسزی کے ہم عصر و ہم خیال

شاگردوں میں سعید شہیدی، اوج یعقوبی بھی تھے۔ یا حیات شاعروں میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور خواجہ شوق بھی اُن کے قدر دانوں میں ہیں۔ معین بزمی کے شاگردوں میں بسمل نصیر الدین بسمل ایک مشہور شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بسمل صاحب بزمی صاحب ترنم ہی میں کلام سناتے ہیں بزمی صاحب کا ترنم بڑا دم دار تھا جھوم کر کلام سناتے تھے۔ بزمی صاحب سے جب کبھی ملاقات ہوتی وہ اپنی خوش مزاجی، محبت و خلوص کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کا مجھے نیر کہہ کر مخاطب کرنا اچھا لگتا تھا۔

طالب رزاقی

(مشاعروں کے ناگزیر خوش گلو استاد شاعر)

اچھی آواز اور اچھا ترنم خدا کی دین ہوتا ہے وہ شاعر بھی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں جو شاعرانہ ترنم میں شعر سناتے ہیں بہترین ترنم اچھے شعر کو دو آتشہ بنا دیتا ہے جگر مرادآبادی، بہزاد لکھنوی، فنا نظامی، نسیم جے پوری، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطانپوری، مخدوم، وجد جیسے خوش گلو شاعروں نے اپنے بہترین کلام کے ساتھ پر اثر ترنم سے مشاعروں کی نوعیت ہی بدل دی۔ ترقی پسند شاعروں نے ترنم کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن مخدوم محی الدین اور مجروح سلطان پوری نے ہمیشہ ترنم میں ہی کلام سنایا اور مشاعروں میں کامیاب رہے۔ حیدرآباد کے سینئر شاعروں میں مخدوم محی الدین، [illegible] علی [illegible]، شاہد صدیقی، کنول پرشاد کنول، سعید شہیدی، [illegible] باقی، [illegible]، [illegible] اریب، امیر احمد خسرو، ابن احمد تاب [illegible] مخصوص ترنم سے اپنی شاعرانہ شناخت بنائی [illegible]

گیا۔ طالب رزاقی ترنم میں کلام سناتے تو سارے مشاعرے پر ایک پُر کیف و پُر اثر کیفیت طاری ہوتی تھی ۔ میں نے طالب رزاقی کو ہمیشہ ترنم میں کلام سناتے دیکھا ہے اپنے دور کے صف اول کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا چاہے شہر کے مشاعرے ہوں کہ اضلاع کے مشاعرے، طالب صاحب مشاعروں کے لیے ناگزیر تھے ۔ میں نے انہیں بیسیوں مشاعروں میں سنا ہے حیدرآباد میں شاعروں کی نشستوں کے لیے کچھ ہوٹلیں مخصوص تھیں نئے شہر کے اورینٹ ہوٹل، پرانے شہر کے مدینہ ہوٹل اور پیالس ہوٹل میں شعراء بیٹھے رہتے تھے طالب رزاقی زیادہ تر پیالس ہوٹل میں بیٹھے تھے اس ہوٹل کی ایک مخصوص گوشے میں اپنے شاگردوں میں گھرے رہتے تھے ۔ ان کے شاگرد اپنے اپنے طے شدہ وقت پر آتے اور اپنے استاد سے اپنا تصحیح شدہ کلام لے لیتے اور تصحیح شدنی کلام استاد کے حوالے کرتے اسی وقت کلام پر اصلاح لیتے تھے طالب رزاقی اپنی بہترین شاعری کی وجہ سے شہر کے اہم علمی و ادبی اداروں، ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو کے مشاعروں میں خصوصیت کے ساتھ مدعو کیئے جاتے تھے پرانے شہر کے ان کے ہم عصر شاعروں میں اوج یعقوبی، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، خواجہ شوق، خیرات ندیم وغیرہ ان کے قریب تھے ۔ دلیسے شہر کے اساتذۂ سخن میں علامہ نجم آفندی، مولانا کامل شطاری، حضرت قدر عریضی، علامہ ناصر زیدی، حضرت تاج قریشی سے بھی ان کے روابط تھے طالب صاحب سینئر اساتذہ کرام کا عزت کرتے تھے انہوں نے شاید شراب کو چھوا نہیں البتہ چائے سگریٹ

کے وہ بہت عادی تھے اضلاع کے مشاعروں کے بے حد مقبول شاعر تھے بعض
مشاعروں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ ان سے بعد سنانے والے شاعروں کو
نسبتاً کم داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اضلاع کے شاعروں میں بھی ان کے بہت سے
شاگرد ہیں۔ طالب رزاقی جہاں بہترین غزل گو شاعر تھے وہیں ان کی مذہبی
شاعری نعت شریف وغیرہ کافی پسند کی جاتی رہی۔ ڈاکٹر سید محی الدین
قادری زور ان پر خاص مہربان تھے ادارہ ادبیات اردو کے اکثر مشاعروں
میں وہ مدعو رہتے تھے حیدرآباد میں ان کے چاہنے والوں کی کثیر تعداد تھی
طالب رزاقی سے میری کوئی خاص رسم و راہ نہیں تھی لیکن میں اُن کی شاعرانہ عظمت
کا دل کی گہرائیوں کے ساتھ معترف تھا۔ طالب رزاقی کا کلام آل انڈیا ریڈیو
سے نشر ہوتا تھا اخبار "سیاست" میں ان کی غزلیں شائع ہوتی تھیں
بعض ادبی رسائل میں ان پر تعارفی مضامین شائع ہو چکے ہیں مجھے
بھی یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ میں "سیاست" کے لیے اُن کے فن و شخصیت
پر مضمون لکھوں "سیاست" میں ۱۹۶۰ء میں اردو دنیا کے مشہور و ممتاز
شاعروں پر تعارفی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا یہ میں ہی اس کالم
میں لکھا کرتا تھا۔ میں نے اس کالم کے لیے ۴۲ شاعروں پر (قلی قطب شاہ سے
لے کر محسن اختر تک) مضامین لکھے جو "سیاست" میں ہر ہفتہ شائع ہوتے
رہے۔ اس تعارفی مضمون کے لیے مجھے طالب صاحب سے شخصی ملاقات کرنی پڑی
تھی میں نے باضابطہ اُن سے انٹرویو لیا تھا۔ جو "سیاست" میں شائع
ہوا طالب رزاقی کی علالت کے دوران ادبی ٹرسٹ اور سیاست نے رقمی

اعانت کی۔ خاص طور پر جناب محبوب حسین جگر نے طالب رزاقی کی کافی مدد کی۔
جب وہ کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا تھے جگر صاحب اُن کی عیادت کے لیے
جایا کرتے تھے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے طالب رزاقی کے انتقال کے بعد بھی
ان کے اہل خاندان کی مختلف ذرائع سے رقمی اعانت کی۔ طالب رزاقی محلہ
بھیر پورہ میں سکونت پذیر تھے۔ طالب رزاقی ۱۹۲۰ء میں حیدرآباد کے
ایک مشائخ گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد محترم الحاج شاہ محمد یوسف قادری
اردو فارسی کے شاعر تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ان کے چچا ہوتے تھے
طالب رزاقی اپنے والدین کی نگرانی میں اپنی ابتدائی دینی و مذہبی تعلیم حاصل کی
فانی بدایونی اور علامہ حیرت بدایونی سے مشورہ سخن کرتے تھے طالب رزاقی
ڈیڑھ سال تک مرض کینسر میں مبتلا رہ کر ۳۱ ڈسمبر ۱۹۷۵ء کو انتقال کر
گئے۔ اردو اکیڈیمی آندھراپردیش نے ان کے منتخب کلام کا مجموعہ نوائے
طالب کے نام سے شائع کیا۔ مومن خان شوق کلیم قریشی جوہر ہاشمی
نادر اسلوبی کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ طالب رزاقی حیدرآباد کے تمام
ادبی حلقوں کے لئے قابلِ قبول شاعر تھے میں نے تنے شہر کے اہم مشاعروں
کے علاوہ انھیں پرانا شہر کے مخصوص مشاعروں اور چھوٹے چھوٹے مشاعروں میں
بھی کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے اضلاع کے شاعروں میں کلیم قریشی اور
نادر اسلوبی ان کے خاص شاگرد تھے شہر کے خاص شاگردوں میں مومن خان
شوق کے ساتھ جوہر ہاشمی کا نام بھی لیا جاتا ہے جس زمانے میں طالب رزاقی
کی شاعرانہ شہرت عام تھی اُس زمانے میں خاص طور پر پرانا شہر میں اوج یعقوبی

کا طوطی بولتا تھا۔ اوج یعقوبی کے شاگردوں کا بھی ایک بڑا حلقہ تھا۔
خواجہ شوق کا شمار بھی حیدرآباد کے اساتذہ میں ہوتا ہے ان کے بھی کئی شاگرد ہیں بلکہ حضرت اوج یعقوبی کے انتقال کے بعد ان کے بہت سے شاگرد شوق صاحب سے رجوع ہوگئے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ طالب رزاقی اضلاع کے مشاعروں میں حیدرآباد کے دیگر مدعو شاعروں سے پہلے پہونچ جاتے تھے۔ بعض دفعہ تو وہ مشاعرہ سے ایک دو دن پہلے پہونچ جاتے اور مشاعرہ کے بعد رہ بھی جاتے۔ دراصل ان کے شاگردوں کی خواہش پر وہ رک جاتے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ راست خواجہ حمیدالدین شاہد طالب رزاقی کو بہت پسند کرتے تھے۔ خواجہ حمیدالدین شاہد کی وجہ سے بھی طالب رزاقی ڈاکٹر زور کی عنایتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ طالب رزاقی صاحب کو حیدرآباد میں منعقد ہونے والے بڑے بڑے جلسوں رحمتہ اللعلمین میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا۔ میں نے تعمیر ملت کے سالانہ جلسے کے موقع پر انہیں کلام سناتے دیکھا ہے تعمیر ملت کے شاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ جس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام اگزیکیٹیو ایاز انصاری اور فاروقی صاحب تھے اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے انہیں زیادہ سے زیادہ کلام سنانے کا اعتراز حاصل تھا۔ طالب رزاقی صاحب طرحی مشاعروں میں بھی اپنی مرصع غزلوں سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔
ان کا کلام اگرچہ خالص کلاسیکی شعری ادب کا ترجمان رہتا تھا لیکن عصری آگہی نے بھی ان کے کلام کو زیر اثر بنا دیا ہے ان کے اشعار میں معاشرہ کے

شگفتہ مسائل بھی ملتے ہیں۔ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ علم عروض سے کما حقہ واقفیت تھی کلاسیکی اقدار کے ترجمان ہونے کی وجہ سے ان کے اشعار میں بھی کلاسیکی رنگ بہت گہرا تھا شعر و ادب کے تقریباً تمام حلقوں میں ان کے کلام کی پذیرائی ہوتی رہی۔ طالب رزاقی صاف ستھرا لباس پہنتے تھے میں نے انہیں ہمیشہ شیروانی پہنے ہوئے دیکھا ہے وضع دار شخصیت کے حامل تھے اگرچہ اپنے ہم عصروں میں گھل مل کے رہتے تھے اس کے باوجود وہ کم آمیزی کو ترجیح دیتے تھے۔ غیر ضروری گفتگو سے گریز کرتے تھے طالب رزاقی صاحب کا شمار بھی پرانا شہر کے اہم اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں ہم نوجوان شاعروں کی حوصلہ افزائی میں فراخ دلی سے کام لیا کرتے تھے۔ طالب رزاقی میں نام و نمود کا شائبہ تک نہ تھا ہمارے شہر کے ایک مقبول، معتبر اور اہم شاعر تھے نیک صفت انسان تھے طالب رزاقی بھی حیدرآباد کے اُن شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیت سے اپنی شاعرانہ حیثیت کو منوالیا طالب رزاقی کا نام حیدرآباد کی ادبی و شعری تاریخ میں دیگر مقبول شاعروں کے ساتھ محفوظ رہے گا۔

ہاشم سعید

(نامور صحافی، دیدہ ور بہترین انسان، فرض شناس شخصیت)

مقناطیسی خصوصیات کی حامل شخصیتیں حسنِ صورت سے ہی نہیں حسنِ اخلاق سے بھی گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ ایسی پُرکشش شخصیتوں کا ہر عمل شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے وہ اپنے ساتھیوں میں کچھ اس طرح رہتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے تمام ساتھیوں سے الگ حیثیت کا حامل ہے اور اگر اس طرح کا شخص اپنے طور طریق میں امتیازی خصوصیات رکھتا ہو تو وہ اپنی شخصیت کی نشوونما کا خود ذمہ دار رہتا ہے وہ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی صرف اپنے ساتھ رہتا ہے۔ اپنی دنیا میں رہتا ہے۔ اپنے کام سے غرض رکھتا ہے دوسروں کے معاملات میں نہ تو دخیل ہوتا ہے نہ ہی حارج بلکہ دور رہ کر کچھ اس طرح اُس موثق موقف کا جائزہ لیتا ہے کہ ہر قسم کے حالات خود بہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے ہیں ویسے بھی دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی ایک معقول انسان کبھی پسند نہیں کرتا البتہ اس طرح کے لوگوں کی مشاورت حالات کو

بہتری کے لئے سود مند و کارآمد ہوتی ہے۔ خود شناس، عقاب نظر، معاملہ فہم اور دیدہ ور لوگوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ روشنی کا پیغام بن کر خوشبو کو دور دور تک پھیلانے کا محرک ہوتا رہتا ہے۔ اچھی زندگی گزارنے والے ہمیشہ اصول پسند، صاف ستھرے ذہن و فکر کے مالک ہوتے ہیں ان کی ساری زندگی بے داغ رہتی ہے وہ معاشرہ کے شائستہ لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ، ان کا طرز حیات خود ان کا ہوتا ہے وہ مانگے کا اجالا لے کر قائم نہیں رہتے۔ اپنی دنیا خود بنا دیتے ہیں۔ اپنے راستے خود تیار کرتے ہیں اور اپنی منزل کا خود تعین کرتے ہیں سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب سے الگ رہنے والوں میں ایک شخصیت ہاشم سعید کی بھی تھی جو روزنامہ سیاست کے آغاز سے تا دم حیات وابستہ رہے۔ ہاشم سعید سیاست اسٹاف کی سب سے اہم شخصیت تھے جن نے اپنے ۴۴ سالہ سیاست سے وابستگی کے دور میں سیاست اسٹاف میں سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع مقام والے صرف اور صرف ہاشم سعید کو پایا۔ ہاشم سعید ہمیشہ ہی عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب کی نظروں میں رہتے تھے۔ اخبار کے اکثر معاملات میں ہاشم سعید صاحب سے مشاورت کی جاتی تھی۔ نہایت ذمہ دار، ایماندار اور سیاست سے اٹوٹ رشتہ رکھنے والے باوقار انسان تھے جب سیاست اخبار کا اجراء عمل میں آیا تو سیاست کے خدوخال میں رنگ بھرنے کے لیے کچھ اعلیٰ دماغ لوگوں کی ضرورت تھی ہاشم سعید بر ایسے وقت ہمیر دست راست رہے۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب ہاشم صاحب کی بہت عزت کرتے تھے ان کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے سیاست کے اسٹاف میں

ہاشم سعید صاحب کی یہی پوزیشن تھی۔ عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب اخبار کے سلسلے میں کسی خاص فیصلہ پر پہونچنے کے لمحات میں ہاشم صاحب سے بھرپور تعاون حاصل کرتے تھے جس زمانے میں سیاست کا اجراء عمل میں آیا وہ دور پولیس ایکشن کے دہشت ناک حالات سے متاثر، پریشان کن دور تھا مسلمانانِ حیدرآباد ریاست کے ختم ہونے کی وجہ سے افراتفری کے شکار ہو چکے تھے ان گرم حالات میں اخبار نکالنا بڑے حوصلہ کا کام تھا جب عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب نے اخبار نکالنے کا عزم صمیم کیا تو ہاشم صاحب ذہنی و جسمانی طور پر اخبار کے لیے وقف ہو گئے۔ ہاشم سعید صاحب سے سیاست سے میری وابستگی (۱۹۵۹ء) کے زمانے میں کسی بھی قسم کی رسم و راہ نہیں تھی۔ ویسے بھی سیاست سے وابستگی کے ابتدائی دنوں میں، میں ہفتہ میں صرف دو دن کچھ دیر کے لیے سیاست جاتا تھا۔ محفلِ شعر سے متعلق اشعار حاصل کرنے کے لیے اور ترتیب دیئے ہوئے کالم کی حوالگی کے لیے۔ جب ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو ہاشم سعید صاحب سے مجھے قربت حاصل ہونے لگی۔ ادبی ٹرسٹ کی ادبی لقاریب کے علاوہ مشاعروں کے سلسلے میں ہاشم سعید صاحب ہر فیصلہ میں شریک رہتے تھے جب مہمان و میزبان شعراء کے انتخاب کا اجلاس ہوتا تو اُس اجلاس میں عابد علی خان صاحب، جگر صاحب، ہاشم سعید صاحب کے علاوہ میں بھی رہتا تھا۔ اتفاقِ آراء شعراء کا انتخاب ہوتا تھا لیکن مشاعرہ کے قریب، ناموں میں بعض تبدیلیاں ضروری ہوں تو جگر صاحب خود کرتے اور اپنے فیصلے سے واقف کراتے تھے ہاشم سعید صاحب سیاست میں رات کے ایڈیٹر ہوتے تھے

یعنی جگر صاحب کے گھر جانے کے بعد وہ ۸ بجے شب سیاست آجاتے تھے۔ جگر صاحب صبح ۹ بجے سیاست آتے اور ۸ بجے شب تک رہتے۔ ۸ بجے کے بعد سے سیاست کی آخری کاپی پریس کے حوالے کرنے تک ہاشم سعید سیاست میں موجود رہتے۔ اور انچارج کی حیثیت سے اپنے مکمل اختیارات کو کام میں لاتے تھے اگر کوئی خاص نیوز ہو یا کوئی خاص بات ہو تو جگر صاحب کو مطلع کرتے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جگر صاحب لازماً اخبار چھپنے سے پہلے کسی بھی وقت "سیاست" آفس پہونچ جاتے تھے ہاشم صاحب نے کئی برس رات کی ڈیوٹی انجام دی۔ کام کی نوعیت کے لحاظ سے کبھی کبھی وہ دن میں بھی سیاست آجایا کرتے تھے ہاشم صاحب نے اپنی ساری ملازمت اعتماد کے فضاء میں گزاری۔ کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے تمام ساتھی ان سے خوش رہتے۔ ہاشم صاحب اپنی اعتدال پسندی کی وجہ سے بھی سیاست آفس میں شہرت رکھتے تھے متوازن طبیعت نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ خودداری، اصول پسندی، فرض شناسی ان کی اپنی مثال آپ تھی۔ سیاست کا تمام اسٹاف ہاشم صاحب کی عزت کرتا تھا ان کے ساتھ ان کا حسن سلوک یکساں رہتا انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران اپنے کسی بھی ساتھی کا دل نہیں دکھایا۔ ان کے انتقال سے خلا محسوس ہونے لگا ہے۔ کاروبار دنیا جاری رہتے ہیں لوگ آتے ہیں جاتے ہیں لیکن ان کی اچھائیاں، یادوں کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں سیاست میں ہاشم صاحب، عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کے بعد میرے محسن تھے ہاشم صاحب

مجھے بہت عزیز رکھتے تھے ان کا سلوک مجھ سے چھوٹے بھائیوں جیسا تھا میرا رکھ رکھاؤ انہیں پسند تھا میری راست گوئی اور اپنے کام میں میری گہری وابستگی سے وہ خوشی محسوس کرتے تھے ہمیشہ انہوں نے مجھے نیر کہہ کر مخاطب کیا۔ کبھی نیر صاحب نہیں کہا۔ ان کا انداز تخاطب مخلصانہ ہوتا تھا۔ ان میں غیر معمولی اپنائیت تھی۔ مجھ پر اعتماد کرتے تھے اور میرے احساس ذمہ داری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ میں انہیں ہاشم بھائی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ صنعتی نمائش کے سلسلے میں کئی برسوں سے نمائش کلب میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ میں گزشتہ زائد از ۲۵ برس سے مشاعرہ کا ناظم رہا ہوں ہاشم سعید صاحب کی عنایت سے مشاعرہ کا میں نہ صرف معتمد رہا بلکہ مجھ سے شعراء کی فہرست طلب کی جاتی اور تقریباً میرے اپنے دیئے ہوئے نام مدعو شعراء کی فہرست میں شامل رہتے بہ الفاظ دیگر شعراء کا انتخاب ہاشم صاحب کی سرپرستی میں میرا ہی رہتا۔ ہاشم صاحب کی وجہ سے نمائش سوسائٹی کے ارکان سے میری جان پہچان ہوئی اور پھر شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں کی وجہ سے تو تمام ارکان نمائش سوسائٹی میرے کام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا کرنے میں شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں کا آغاز جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب کی شخصی دلچسپی سے ہوا ـــــ

بہ الفاظ دیگر ان دونوں شخصیتوں نے ہی شنکر جی میموریل سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ تقریباً ۱۹ برس تک شنکر جی مشاعرے عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کی راست نگرانی میں منعقد ہوتے رہے۔ ۱۹ برس تک شعراء سے مراسلت کا کام میرے

ذمے رہا۔ عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کی منظوری کے بعد کا [illegible]
اس مشاعرہ کے روح رواں نمائش سوسائٹی کے جواں سال ارکان محی الدین جیلانی
سریندرجی اور وینکٹ راؤ مشاعرہ کے انصرام میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے ہاشم
سعید صاحب بھی بہت سے معاملات میں دخیل رہتے تھے مجھے ہر سال نمائش
سوسائٹی کے دوران شعبہ پبلیسٹی کے انچارج رہتے تھے مجھے ہر سال نمائش
سوسائٹی کے پاس لیتے تھے۔ ادھر کچھ برسوں میں نمائش کلب کا
ایک خاص کارڈ بھی دیا کرتے تھے۔ جب کبھی میں نمائش کلب آتا تو وہ کارڈ میری
شیروانی پر لگا رہتا۔ ہاشم سعید نے کچھ اس انداز سے نمائش سوسائٹی کے ارکان
کے سامنے میری پوزیشن کو برقرار رکھا کہ ان کے انتقال کے بعد بھی نمائش کلب کے
مشاعروں کا معتمد میں ہی رہا کرتا ہوں۔ نمائش سوسائٹی کی ایک نہایت متحرک
فعال شخصیت محی الدین جیلانی کی بھی تھی جو ہاشم سعید صاحب کے زمانے میں بھی
کلب کے مشاعروں کے سلسلے میں دلچسپی لیتے تھے لیکن شعرا کا انتخاب اور مشاعرہ
کے انتظام کی تمام تر ذمہ داری مجھے پورے اعتماد کے ساتھ سونپ دیتے تھے۔
ہاشم سعید صاحب اور محی الدین جیلانی کی وجہ سے نمائش کلب کے مشاعروں اور
تہذیبی پروگرام میں ایک تسلسل باقی رہا۔ توقع ہے کہ اب بھی رہے گا ہاشم سعید
صاحب نہایت با اخلاق، بامروت، نفیس انسان تھے ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں
کے انعقاد میں پہلے مشاعرہ سے ان کی حیات تک مشاعروں میں اہم ذمہ داریوں
کو نبھاتے رہے۔ مشاعرہ گاہ کا مکمل انتظام ان کے ذمے ہوتا۔ نہایت
پرسکون انداز میں مشاعرہ گاہ کو آراستہ کرتے بہترین انتظام سے شرکائے محفل

کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہاشم صاحب، عابد علی خان صاحب کے دولت
خانے پر منعقد ہونے والے تہذیبی پروگراموں میں شرکت کرتے تھے سیاست
سے ان کا رشتہ مضبوط رہا۔ سیاست سے ان کی وفاداری اور گہری وابستگی
مثالی رہی۔ ہاشم صاحب کا سیاست کی زینہ بہ زینہ ترقی کے لیے پوری دیانتداری
کے ساتھ تعاون رہا۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب ہاشم سعید صاحب
کو صرف ہاشم کہہ کر مخاطب کرتے کبھی انہوں نے ہاشم صاحب یا ہاشم سعید صاحب
نہیں کہا۔ ان کا یہ اپنا پن تھا کہ انہوں نے اپنی اپنائیت کا ہمیشہ عملی ثبوت
دیا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل سے ان کی صحت خراب تھی۔ جب بھی ہاشم سعید صاحب
کی یاد آتی ہے تو مجھے ان کی وہ تمام مہربانیاں یاد آتی ہیں جنہیں میں تاحیات
نہیں بھول سکتا۔ ہاشم سعید صاحب سیاست کے سینئر سب ایڈیٹر تھے ان
کے بے شمار انٹرویوز اور مضامین سیاست میں شائع ہو چکے ہیں۔ آخری
دنوں میں بیماری کی وجہ سے سیاست سے تعلق برقرار نہ رکھ سکے۔ جب جگر صاحب
کا انتقال ہوا تو کچھ عرصہ تک سیاست اخبار کے آخری اور پہلے صفحہ کی ذمہ داری
انہیں سونپی گئی تھی۔ ہاشم صاحب اسکوٹر پر سیاست آتے تھے جب وہ جگر صاحب
کے انتقال کے بعد رات کی ڈیوٹی کے انچارج مقرر ہوئے تو سیاست سے ان
کے لیے موٹر کار بھیجوائی جاتی تھی اور موٹر کے ذریعہ واپس ہوتے تھے ہاشم صاحب
کو اساتذہ سخن کے بہت سے شعر یاد تھے کئی گلوکاروں کے کیسٹ ان کے ہاں
موجود تھے وہ رؤف صاحب کے بہت مداح تھے ہاشم صاحب کا انتقال ۱۹۹۹ء میں ہوا
انکی تدفین مسجد الہی چادر گھاٹ میں عمل میں آئی۔ بہ قول سکندر علی وجد

جانے والے کبھی نہیں آتے ؎ جانے والوں کی یاد آتی ہے

عاتق شاہ

صاف گو، پاک باطن ـ کھرا انسان ـ منفرد افسانہ نگار

ایسا قلم کار جو میں ہوتے ہوئے بھی ہم کہتا ہے مجھے اچھا لگتا ہے یعنی میں کہتا ہوں کی بجائے ہم کہتے ہیں کہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ قلم کار تنہا نہیں ہے سب کا ہے سب کے ساتھ ہے۔ تنہائی کا رونا نہیں روتا سب کے ساتھ رہنے کی بات کرتا ہے۔ اپنی ہی ذات میں گم رہنا ۔ اپنے ہی بارے میں سوچتے رہنا کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ خاندان سے الگ اور ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنا ایک انسان کو بے شمار الجھنوں میں مبتلا کرتا ہے۔ ان گنت مصائب کا وہ شکار ہو جاتا ہے۔ معاشرہ سے کٹ کر رہنا مصائب کو دعوت دینا ہے سچا فنکار کبھی تنہا نہیں رہتا ۔ اور اگر وہ تنہا ہے بھی تو معاشرہ کی نرمی و گرمی اس کے ساتھ رہتی ہے دھوپ چھاؤں کی تمازت و راحت رگ و پے میں حرارت پیدا کر دیتی ہے پھر خیالات کا ہجوم اس کو تنہا کب رہنے دیتا ہے زندگی کی تمام تبدیلیاں اس کے

ساتھ ساتھ رہتی ہیں وہ دونوں کیفیات سے گزرتا رہتا ہے اور ہماقترہ میں ایک فعال وکارکرد شخص کی طرح رواں دواں رہتا ہے عائق شاہ کی کہانیوں میں اگرچہ "میں" زیادہ ہے۔ لیکن ان کی تحریروں کا یہ غور مطالعہ کیا جائے تو ان میں "میں" "ہم" پنہاں ہے عائق شاہ محفل کے آدمی تھے ہمیشہ نرم وگرم حالات کا شکار رہا کرتے۔ انھوں نے زندگی کے ہر رنگ کو اپنا لیا تھا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی نجی زندگی میں مایوسی کو اپنے نزدیک آنے نہیں دیا۔ وہ مسلسل سفر کے قائل تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ تا حیات چلتے رہے ہیں انھوں نے کبھی بھی رک کر دم نہیں لیا۔ ان کی تحریروں میں ظلم واستبداد کے شکار پریشان حال لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ سماج میں نابرابری کے واقعات ملتے ہیں۔ بھوک، پیاس اور کشمکش حیات کا حال ملتا ہے عائق شاہ ایک منفرد افسانہ نگار تھے۔ ملک گیر شہرت رکھنے والے افسانہ نگار تھے عائق شاہ کے افسانوں کے کردار ستائے ہوئے انسان ہیں۔ مظلوم و بے سہارا لوگ ہیں۔ عائق شاہ نے تمام کرداروں کو ساتھ ساتھ ابھرنے کا موقع دیا ہر ایک کے وجود کو تسلیم کیا۔ ان کی نظروں میں اُن کے افسانوں کے تمام کردار اپنا ایک الگ وجود رکھتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی بھی کردار کو معلق نہیں رکھا اُن سے کام لیا ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ کردار آخری منزل تک ساتھ دیتے ہیں اور کچھ بیچ راستے میں ہی چھوڑ جاتے ہیں لیکن وہ ادھورے نہیں لگتے بیچ راستے میں اگرچہ کہ وہ چھوٹ جاتے ہیں مگر ان کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ کہانی کے ختم ہونے کے باوجود بھی وہ کردار ختم نہیں ہوتے دوسرے مرکزی

کرداروں کی طرح عاتق شاہ کا قلم جب کسی موضوع پر اٹھتا ہے تو پھر رکتا نہیں۔ سفر جاری رہتا ہے عاتق شاہ آندھیوں اور طوفانوں کے مقابل بھی باحوصلہ رہتے ہیں اور دھیرے دھیرے تمام راستوں سے گزرتے ہوئے بامقصد زندگی کے آخری حصوں تک پہونچ جاتے ہیں لیکن بات وہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہی فن کار کامیاب فن کار کہلاتا ہے جس کا تخلیقی سفر جاری رہتا ہے بظاہر قارئین کی نظروں میں افسانہ ختم ہوجاتا ہے لیکن اس کے کردار ختم نہیں ہوتے۔ عاتق شاہ اپنی معاشی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے مختلف نشیب و فراز سے گزرتے رہے۔ حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمت نہیں ہاری سماج سے آنکھ ملاکر گفتگو کرتے رہے۔ ان کا لب و لہجہ حالات کی بے رخی کے سامنے کبھی کمزور نہیں پڑا۔ انھوں نے مشکلات کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا۔ بلکہ وہ سینہ تان کر نیرنگی حالات کی کرشمہ سازیوں کو دیکھتے رہے اور پوری طاقت و حوصلہ کے ساتھ زندگی کے ایک ایک پل کی قدر کرتے رہے کبھی بھی لمحہ زندگی کو ضائع نہیں کیا۔ بامقصد زندگی گزارتے رہے۔ اپنے قلم کی جولانی دکھلاتے رہے۔ دوستوں سے خندہ پیشانی سے ملتے رہے۔ عاتق شاہ کا پیدائشی نام اور اصلی نام شیر محمد خان تھا۔ قلمی نام عاتق شاہ ــــ جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا ۱۹۶۵ء میں بہ حیثیت لکچرار اور صدر شعبہ اردو پیپلس آرٹس اینڈ سائنس کالج ناندیڑ میں ملازمت اختیار کی۔ ۷ اگست ۱۹۷۰ء کو بہ حیثیت لکچرار اردو سردار پٹیل کالج سکندرآباد میں ملازم ہوئے

نومبر ۱۹۹۱ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ پہلا افسانوی انشائیہ گرگٹ اخبار میزان میں ۱۲ مئی ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا۔ ہندوستان و پاکستان کے ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ فٹ پاتھ کی شہزادی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ افسانے کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ایک وقت کا کھانا (مارچ ۱۹۵۲ء) اندھیری (نومبر ۱۹۵۲ء) مائی ڈیر شکنتلا (یکم ستمبر ۱۹۵۵ء) ہم جنم جنم کے ساتھی (جون ۱۹۶۸ء) راستے کی کہانی (نومبر ۱۹۷۸ء) ہنس کی خاموشی (ڈسمبر ۱۹۸۶ء) طنز و مزاح میں چالیس قدم (جون ۱۹۶۱ء) انڈین کاجو (ڈسمبر ۱۹۷۹ء) ماموں کی بکریاں (ڈسمبر ۱۹۹۶ء)۔ رپورتاژ۔ عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک (جون ۱۹۶۶ء) خالی ہاتھ (مئی ۱۹۷۲ء) نثری تمثیل۔ میں تنہا سناتا ہوں (اکتوبر ۱۹۹۲ء) سوانح۔ میں جیتوں گا (۱۹۹۴ء) ان کی بیشتر کتابوں پر ملک کی اُردو اکیڈیمیوں کی جانب سے انعامات ملے۔ ۲ مئی ۱۹۹۹ء کو انتقال ہوا۔

عاتق شاہ صاحب سے میری پہلی ملاقات مائی ڈیر شکنتلا کی معرفت ہوئی۔ شکنتلا نے مجھے اپنے حسنِ ظاہری و باطنی سے متاثر کیا۔ اس کے خط و خال نے گرویدہ بنا دیا تھا اس کی خوشبو میرے دل و دماغ کو مہکاتی رہی۔ شکنتلا مجھے کسی دربارِ خاص میں نہیں دربارِ عام میں ملی۔ اور پہلی ملاقات میں اس سے میری دوستی ہوگئی۔ شکنتلا اب بھی میرے ساتھ رہتی ہے (شکنتلا اُن کے افسانوں کی چوتھی کتاب ہے) عاتق شاہ صاحب سے ادبی محفلوں میں ملاقات ہوتی رہی۔ ہماری دوستی یا ملاقات کی عمر تین دہوں سے زیادہ مدت کی رہی۔

بڑے خوش مزاج انسان تھے جب بھی ملاقات ہوتی وہ مصافحہ کے بعد گلے ضرور ملتے تھے بعض دفعہ مصافحہ کے بغیر ہی گلے ملتے تھے کوئی خاص بات ہو اور خاص طور پر ایسی بات جو ان کے فکر و فن کی ہو تو کہتے "مصافحہ" مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھ جاتا۔ بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے تھے جس میں خلوص ہوتا تھا اپنا پن ہوتا تھا مصافحے کے دوران ان کی ہتھیلی کی نم دبیز تمام حرارت ملنے والے کی ہتھیلی میں اتر جاتی تھی۔ عاتق شاہ ترقی پسند قلمکاروں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے شہر میں جتنے سینیئر ترقی پسند قلم کار تھے ان سے ان کا یارانہ تھا اپنے تمام ساتھیوں کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ اپنے بہترین روابط کا احساس دلاتے تھے عاتق شاہ صاحب کے بعض مخصوص دوست تھے جن کے ساتھ ان کا زیادہ وقت گزرتا تھا عاتق شاہ صاحب سے میری بھی رسم و راہ کافی پرانی تھی۔ وہ ہم سے ملنے مدینہ ہوٹل آیا کرتے تھے یہ بات ۲۵ برس پہلے کی ہے جب میں اپنے مبتدی شاعر دوستوں کے ساتھ مدینہ ہوٹل میں رات کے وقت بیٹھا کرتا تھا ہماری مدینہ کی نشستوں میں رئیس اختر کے علاوہ کبھی کبھی نامر کسریتوں بھی شریک رہتے۔ عاتق شاہ صاحب گاہے ماہے رونق افروز ہوتے تھے حیدرآباد میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیاء ہوا تو عاتق شاہ بھی اس سے وابستہ ہوگئے بلکہ ایک میعاد کے لیے وہ صدر انجمن ترقی پسند مصنفین بھی رہے ان کے دور میں گاندھی بھون میں ۲۱، ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء دو روزہ ترقی پسند مصنفین کی عالیشان پیمانے پر کانفرنس ہوئی جس میں علی سردار جعفری، قمر رئیس، سید عابد حسین اور راجیو سکسینہ نے بھی شرکت کی تھی۔ شہر کے مشاہیر ترقی پسند ادیب ڈاکٹر

راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ راشد آذر معتمد تھے راقم الحروف اور نصرت محی الدین شریک معتمد تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ابتدائی جلسے اردو ہال میں ہوتے رہے پھر مستقل طور پر ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ میں ہوتے رہے۔ میرے شاعر دوستوں میں ناصر کرنولی آن سے بہت قریب تھے مدیر شگوفہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور نامور طنز و مزاح نگار مسیح انجم سے ان کے گھریلو روابط تھے۔ عاتق شاہ مجھے بے حد پسند کرتے تھے۔ جب کبھی ملتے کہتے "کیا حال ہے شاعر!" انھوں نے کبھی میرا نام لے کر مخاطب نہیں کیا۔ بہت ہی یار باش، زندہ دل، پاک و صاف انسان تھے محمد قدوس ایڈوکیٹ ان کے ہم محلہ تھے اُن سے بھی عاتق شاہ کی خوب گھلتی تھی۔ ممتاز شاعر ناصر کرنولی کے ادارت میں شائع ہونے والے رسالے "پونم" میں اُن کے افسانے شائع ہوتے رہے شگوفہ میں مستقل طور پر ان کے کالم شائع ہوتے تھے۔ ادبی جلسوں کے علاوہ عاتق شاہ سے دفتر شگوفہ پر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ پبلسس کوارٹرس کے باب الداخلہ پر بھی ملاقات ہوتی تھی جہاں وہ اپنے قلم کار احباب میں گھیرے رہتے تھے۔ ان کا اندازِ گفتگو بے حد دلچسپ رہتا تھا جہاں کوئی نئی بات ہوتی مصافحہ کرتے اور ہاتھ بڑھاتے۔ بہت سے کم عمر اور زیادہ عمر والے بعض دوستوں کی طرح عاتق شاہ بھی اوراقِ ماضی کا حصہ بن گئے۔ یہ میری تاثراتی تحریر اپنے دیرینہ دوست کی دوستی اور محبت کی نذر ہے جو ہمیشہ مجھ سے بھرپور خلوص کے ساتھ ملتے تھے خدا انہیں اپنی جوارِ رحمت میں خاص مقام عطا کرے۔

علی صدیقی

(عالمی مشاعروں کے بانی۔ شاعروں ادیبوں کے سرپرست)

جب کسی شخص کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ آگے چل کر وہ شخص کیا اور کس طرح کے کارنامے انجام دے گا۔ اچانک کچھ ایسا کرشمہ سرزد ہو جاتا ہے کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں کہ یہ کیسا ہوا اور کس طرح ہوا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدائے قدوس جس سے جو کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے، جب کوئی شخص کسی مخصوص شعبہ میں ترقی کے زینے طے کرتا چلا جاتا ہے تو معاشرہ اُس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کچھ ایسے کارنامے انجام دیتا ہے کہ اُس کا وجود اور اُس کے کام مثالی بن جاتے ہیں اور جہاں تک کسی کو نوازنے کی بات ہے یا کسی کے نوازے جانے کی بات ہے یہ صرف رب العزت ہی جانتا ہے کہ کس شخص کو کس طرح نوازا جائے۔ کبھی بعض لوگ ایسے شعبوں میں بھی نوازے جاتے ہیں جن سے بنیادی طور پر ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی ایک معمولی آدمی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دیکھتے ہی دیکھتے

قوم کا بڑا قائدین جاتا ہے اسی طرح ایک شخص جس نے شعر و ادب کا کبھی باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا وہ کچھ اس طرح کے چونکا دینے والے کام انجام دیتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کے ماضی کے بارے میں جھانک کر دیکھا جائے۔ زمانے کے سارے کاروبار موجودہ صورت حال کی روشنی میں جاری رہتے ہیں۔ کل کون کیا تھا اُس کا سوسائٹی میں کیا مقام تھا بہت کم سوچا جاتا ہے۔ آج وہ کیا ہے! آج وہ کون سے اہم کارنامے انجام دے رہا ہے! آج کس کس طرح کی اہم شخصیتیں اس کے زیرِ اثر ہیں اس بات کی اہمیت ہے اس طرح کی خصوصیات کی حامل ایک شکل میری نظر میں ہے جو علی صدیقی کے نام سے جانی جاتی ہے علی صدیقی اپنی ذہانت اور اپنے کمالِ ہوشیاری کے سبب سماج میں اپنا ایک اہم مقام بنالیا تھا۔ چاہے وہ سیاسی میدان ہو کہ ادبی دنیا ان کا نام روزِ روشن کی طرح چمک رہا تھا علی صدیقی کوئی سیاسی قائد نہیں تھے نہ تو وہ کونسلر رہے نہ ایم ایل اے نہ ایم پی رہے اور نہ ہی ریاستی یا مرکزی وزیر رہے ہے لیکن ایک خاص زمانے میں انھوں نے بہت سے سیاسی قائدین کو اپنے اثر و رسوخ سے حکومت کے اعلیٰ مقام پر پہونچایا۔ جب اندرا گاندھی اور پی وی نرسمہا راؤ وزرائے اعظم تھے۔ اُس زمانے میں علی صدیقی کا طوطی بولتا تھا۔ اُس دور میں وہ ایک اہم رابطہ رکھنے والی شخصیت رہے۔ ملک کا بڑے سے بڑا سربراہِ حکومت بعض سیاسی معاملات میں ان سے تعاون حاصل کرتا تھا۔ اہلِ غرض لوگوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ علی صدیقی کی سیاسی، علمی و ادبی حیثیت کیا ہے انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ آج اس شخص کا ستارہ عروج پہ ہے اور اس سے کیا کتنا استفادہ کیا جاسکتا ہے اندرا گاندھی اور

پی وی نرسمہاراؤ کے بیشتر ایسے واقعات ہیں جن میں علی صدیقی کو دخل رہا ہے اندرا گاندھی اور پی وی نرسمہاراؤ سے ملاقات کے لیے لوگوں کو ایک ایک ہفتہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن علی صدیقی کے تعاون سے یہ مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو جاتا تھا وہ جب چاہیے ان دونوں شخصیتوں سے مل سکتے تھے ان کے لیے کسی بھی قسم کی رکاوٹ نہیں تھی بہ الفاظ دیگر علی صدیقی کے لیے ایوان حکومت کے دروازے کھلے ہوئے رہتے تھے۔ ان دو اشخاص کی قربت کی وجہ سے علی صدیقی عالمی شہرت کی حامل شخصیت بن گئے اور ان کا شمار ملک کی صفِ اول کی شخصیتوں میں ہونے لگا۔ علی صدیقی کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتیں ان کے زیرِ اثر آجاتی تھیں۔ دلی کی سیاسی زندگی نے علی صدیقی کو ہر قسم کی سہولتوں سے فیضیاب کیا۔ بے حساب دولت کے مالک بن گئے لیکن انہوں نے جو کچھ ملتا گیا اسے اپنے پاس نہیں رکھا۔ لاکھوں روپے شعری، ادبی و فلاحی سماجی کاموں کے لیے صرف کیے۔ شعری و ادبی دنیا سے ہٹ کر علی صدیقی مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی بار دلی میں کمپیوٹر کی تعلیم کا ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا جو آج بھی کمپیوٹر کا معیاری مرکز سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے حیدرآباد میں سابقہ لبرٹی ٹاکیز بشیر باغ کے قریب کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر قائم کر کے نئی نسل کو عصرِ جدید کے تقاضوں سے روشناس کروایا۔ اس سے ہٹ کر ان کا ایک اہم کارنامہ عالمی مشاعروں کی بنیاد رکھنا بھی ہے علی صدیقی ایک عام آدمی تھے ان کی تعلیم بھی ابتدائی جماعتوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان کا تعلق نہ تو کسی کالج سے تھا اور نہ ہی کسی یونیورسٹی سے۔ اس کے باوجود ملک کی بعض اہم اہم

اہلِ قلم شخصیتیں ان کی کرم فرمائیوں کی مرہونِ منت رہیں۔ اُردو کے تقریباً تمام صفِ اول کے اساتذہ و قلم کار (شاعر و ادیب) ان کے دائرہ اختیار میں تھے علی صدیقی نے عالمی اُردو کانفرنس کی سرگرمیوں کے سلسلے میں تقریباً تمام مشاہیر اُردو زبان و ادب کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا ان کی شایانِ شان قدرت کی۔ کئی اہم شخصیتوں کو ایوارڈز سے نوازا۔ انعامات و اکرامات و اعزازات دیئے اور دلوائے۔ پانی کی طرح روپیہ بہایا لیکن کبھی بھی عالمی اُردو کانفرنس تقاریب کو اعلیٰ معیار سے گرنے نہیں دیا۔ دلی اور ممبئی ہی نہیں بلکہ ملک کے بعض اور شہروں میں علمی و ادبی جلسوں کا اہتمام کیا۔ اس طرح انہوں نے زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ اعلیٰ پیمانے پر علمی و ادبی تقاریب میں روپیہ بہت خرچ ہوتا ہے لیکن علی صدیقی کو کبھی اپنی تنگ دامنی کی شکایت نہیں رہی۔ کسی بھی مہمان کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ علمی و ادبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعض اس قدر اہم اور اعلیٰ پیمانے پر علمی و ادبی تقاریب منعقد کیں کہ ملک کے بڑے سے بڑے ادارے بھی نہ کر سکے۔ علی صدیقی جتنا خرچ کرتے اُس سے کہیں زیادہ پیسہ انہیں ملتا تھا اُن میں یہ بھی صلاحیت تھی کہ خاص طور پر حکومت کی سطح پر کس قسم کا تعاون حاصل کرنا چاہئے وہ جانتے تھے کس محکمہ سے کتنا روپیہ حاصل کیا جا سکتا ہے حکومتی سطح پر اس قدر با اثر تھے کہ ان کا ہر کام بہ آسانی انجام پاتا تھا۔ علی صدیقی کی مہمان نوازی مثالی ہوتی تھی سیاسی، علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ ساری دنیا میں مشاعروں کو فروغ دینے میں علی صدیقی کا نام نمایاں رہے گا۔ مشاعروں کی تاریخ میں ان کا نام صفِ اول کی فہرست میں شامل ہے۔ علی صدیقی نے عالمی اُردو کانفرنس کے زیرِ اہتمام ملک میں ہی نہیں بیرونِ

ملک میں بھی مشاعروں کا اہتمام کیا۔ شعراء کو ان کی حیثیت سے زیادہ نوازا۔ مشاعروں کو وہ اتنا زیادہ معاوضہ دیتے تھے کہ مشاعرے منعقد کرنے والی دوسری تنظیموں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ علی صدیقی نے بے شمار شاعروں اور شاعرات کو روشناس کرایا لیکن ان کی فراخ دلی کی وجہ سے بہت سے متشاعر اور متشاعرات بھی منظرِ عام پر آئے۔ علی صدیقی کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں سے پہلے متشاعروں اور متشاعرات کی اتنی بہتات نہیں تھی ان کی وجہ سے دونوں زمروں کے لوگ زیادہ معاوضہ حاصل کرنے لگے اور ملک اور بیرونِ ملک کے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں علی صدیقی کی غلط بخشش کی وجہ سے جہاں اردو مشاعروں کے ذریعے اردو زبان کی تشہیر ہوئی وہیں مشاعروں کی اعلیٰ روایات کو نقصان بھی پہونچا۔ علی صدیقی کے مشاعروں کے طریقہ کار پر متضاد آراء سامنے آسکتی ہیں اور علی صدیقی کو حیدرآباد سے بہت محبت تھی وہ حتی الامکان اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ ان کے شہر کے شاعر بھی بڑے بڑے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے رہیں۔ وہ کسی تنظیم کا یا حکومت کے کسی سربراہ کی توجہ کا انتظار کیے بغیر اپنے مشاعروں میں حیدرآباد کے بعض نمائندہ شاعروں کو مدعو کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے انھوں نے ممبئی اور دلی کے مشاعروں میں حیدرآباد کے اپنے پسندیدہ شاعروں سعید شہیدی، خیرات ندیم، کنول پرشاد کنول، شاذ تمکنت، صلاح الدین نیر، یوگی حیدرآبادی، عزیز انصاری کو مدعو کیا تھا۔ علی صدیقی صاحب نے مجھے ممبئی کے ایک اور دلی کے دو مشاعروں میں مدعو کیا تھا جب انھوں نے ممبئی کے مشاعرہ میں مدعو کیا تھا اس مشاعرہ میں میرے علاوہ حیدرآباد سے سعید شہیدی، کنول

پرشاد کنول، خیرات ندیم نے شرکت کی تھی۔ دلی کے دو شاعروں میں جو عالمی اردو کانفرنس کی جانب سے منعقد ہوئے تھے امیر احمد خسرو اور مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ دلی میں انہوں نے مجھے اور امیر احمد خسرو کو کسی ہوٹل میں ٹھہرانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ دلی منتقل ہونے سے پہلے علی صدیقی صاحب حیدرآباد میں کل ہند مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے بعض مشاعرے مقامی طور پر بھی منعقد کیے۔ حیدرآباد میں ان کے زیر اہتمام ہونے والے ہر مشاعرہ میں انہوں نے مجھے مدعو کیا تھا۔ شعراء کو مدعو کرنے کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ کیا کرتے تھے جب حیدرآباد سے وہ دلی منتقل ہو گئے تو وہاں کے سیاسی و غیر سیاسی، ادبی و تہذیبی شخصیتوں سے ان کے مراسم بڑھنے لگے۔ میں نے عالمی اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں دیکھا ہے جو ایوانِ غالب، دلی میں منعقد ہوا تھا اس مشاعرہ میں مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور ایسے ہی کئی قدآور شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا میں نے مشاعرے سے پہلے اور دورانِ مشاعرہ یہ محسوس کیا کہ یہ تمام شاعر پوری طرح علی صدیقی کے زیر اثر ہیں۔ علی صدیقی بہت بولتے تھے ان کی بات کو کوئی بھی کاٹ نہیں سکتا تھا۔ بھاری بھرکم شخصیت ہونے کے علاوہ ان کی آواز بھی گرجدار تھی جب وہ کہتے تو لوگ صرف سنتے جاتے تھے درمیان میں کچھ نہیں بولتے تھے ویسے بھی علی صدیقی صاحب کسی کو درمیان میں بولنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کے دبدبہ سے تمام شاعر متاثر تھے بعض بڑے شاعروں کی رقمی اعانت کرتے تھے بعض کے لیے وظائف مقرر کر دیئے تھے ملک بھر کے شاعر علی صدیقی کی چشم کرم کے منتظر رہتے تھے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شعراء کو دل کھول کر معاوضہ دیتے تھے شعراء اور مشاعرہ کی شہرت

کے لیے روپیہ بہت خرچ کرتے تھے کئی علمی وادبی تقاریب کے دعوت ناموں کے علاوہ مشاعروں کے دعوت نامے بھی مثالی ہوتے تھے نہایت دیدہ زیب اور رنگین ہوتے تھے دعوت ناموں میں بھی ان کی انفرادیت تھی ۔ علی صدیق معیاری جلسے کرتے ملک کی جن اہم شخصیتوں کو بھی انہوں نے مدعو کیا وہ بلا تامل شرکت کیا کرتے ۔ اپنے مشاعروں میں پاکستان کے تقریباً تمام اہم شاعروں کو مدعو کرنے کا سہرا علی صدیق کے سر جاتا ہے علی صدیق نے پاکستان میں عالمی اردو کانفرنس کے مشاعرے منعقد کیے ۔ شکاگو میں مشاعرے برپا کیے ۔ علی صدیق حیدرآباد کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن قسمت نے اُن کی اس طرح یاوری کی کہ مٹی سونا ہوگئی ۔ علی صدیق صاحب کا بہت بڑا دل تھا سخی آدمی تھے تب دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے ۔ دلی میں مستقل قیام کے باوجود وہ بار بار حیدرآباد آتے تھے اپنے دوستوں، رشتہ داروں سے ملتے تھے ہر ممکنہ اُن کی مالی امداد کرتے تھے ۔ وہ سیاست آفس بھی آتے تھے عابد علی خاں صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب سے ملاقات کرتے تھے علی صدیق کو ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں سے بھی دلچسپی تھی ایک مشاعرہ میں وہ اپنے ذاتی اخراجات پر مہمان شعراء کو مشاعرہ میں لے کر آئے ۔ سیاست کو ہندوستان کا صفِ اول کا اخبار کہتے تھے علی صدیق صاحب نے اپنی زندگی کے تمام اچھے دن دلی میں گزارے ۔ بے تاج بادشاہ کی طرح رہے ۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی ۔ زندگی میں بہت بھاگ دوڑ کی لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ زندگی کے آخری دن حیدرآباد میں اپنے وطنِ عزیز میں گزارنے

چاہیئے۔ ناسازیٔ مزاج کے باوجود بعض جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے میری شاعری انہیں بہت پسند تھی۔ انہوں نے بہت کچھ سوچا تھا لیکن زندگی نے اُن سے وفا نہیں کی۔ علی صدیقی اپنے وطن حیدرآباد میں سپرد خاک ہوئے۔ مجلس اتحادالمسلمین سے بھی انہیں قلبی لگاؤ تھا جامعہ نظامیہ کی ترقی کے خواہاں تھے حیدرآباد کے شاعروں، ادیبوں کی خدمت انجام دینے کے لیے ٹرسٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ بہت اچھے اچھے منصوبے ان کے دل ہی دل میں رہے جو عملی صورت اختیار نہ کرسکے۔ علی صدیقی کی صحافتی زندگی کا آغاز ان کے ایک مشہور جریدہ "ابن الوقت" سے ہوا۔ علی صدیقی ابتدائی زندگی سے ہی فعال و متحرک رہے۔ لاکھوں روپے کمائے لاکھوں روپے لٹائے۔ اِدھر سے پیسہ آتا رہا اُدھر جاتا رہا۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کے پاس جو بے شمار و نایاب تصویریں ہیں خاص طور پر شاعروں کی۔ ایک خصوصی لائبریری قائم کی جائے۔ ہر انسان کو اپنی زندگی میں دھوپ اور چھاؤں سے سابقہ پڑتا ہے اچھے دن بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور برے دن بھی۔ ہر انسان مختلف خصوصیات کا حامل رہتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ معاشرہ کے مہذب لوگوں کی نظر صبح کی پہلی کرن پر ہی رہتی ہے علی صدیقی صاحب بھی سورج کی وہ پہلی کرن تھے جن کی روشنی خاص طور پر شعر و ادب اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں پھیلتی رہی۔ علی صدیقی کی اردو خدمات کے سلسلے میں اُن کے انتقال کے کچھ دن بعد ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے ایک بڑا تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا تھا جس میں شہر کی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی تھی۔

ابن احمد تاب
(مشاعروں کے کامیاب شاعر)

بعض شاعر مشاعروں کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں جن کے بغیر مشاعروں کی کامیاب فضا میں ایک ٹھہراؤ آجاتا ہے جن کو سننے کے لیے باذوق سامعین جوق در جوق مشاعرہ گاہ چلے آتے ہیں جن کی مقبولیت کا یہ عالم رہتا ہے کہ تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے والے دو طرح کے سامعین ہوتے ہیں کچھ تو خالص ادبی ذوق رکھنے والے ہوتے ہیں جو ہر اچھے شعر پر کھل کر داد دیتے ہیں ان کی نظر میں کسی شاعر کا مشہور و مقبول ہونا ضروری نہیں ہوتا کچھ ایسے سامعین بھی رہتے ہیں جن کی داد و تحسین میں تفریحی انداز بھی شامل ہو جاتا ہے پچھلے زمانے میں تفریحی مزاج رکھنے والے سامعین کی تعداد بہت کم رہتی تھی لیکن ان دنوں مشاعروں کی فضا کچھ اس طرح بدلی ہوئی ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر کو داد دی جارہی ہے یا اس کا

مذاق اڑایا جارہا ہے پچھلے ۲۵، ۳۰ سال پہلے جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں زیادہ تر با ذوق سامعین رہتے تھے آج کل کے مشاعروں میں پچھلی روایتوں کو باقی نہیں رکھا جارہا ہے لیکن اس کی یہ معنیٰ نہیں کہ تمام کے تمام سامعین اس طرح کے ہوتے ہیں حیدرآباد کے مشاعروں میں ملک بھر کے نامور شاعروں کے علاوہ نو آموز شاعروں نے بھی شرکت کی ہے حیدرآباد کے ایسے مشاعرے جن میں صرف حیدرآباد کے شاعر ہی کلام سناتے تھے ان میں اساتذہ سخن اور ان کے شاگرد بھی شامل رہتے تھے آج بھی وہ روایت باقی ہے ہر دور میں آداب محفل کے انداز جداگانہ رہے ہیں۔ پہلے کے مشاعروں میں اساتذہ سخن کے لیے ایک جگہ مختص رہتی تھی جو شہ نشین کے قریب ہوا کرتی تھی ایک طرف شہر کی معتبر شخصیتیں علحدہ مقام پر رونق افروز رہتی تھیں شہ نشین سے ذرا ہٹ کر جونیر شاعروں کی نشستیں رہتی تھیں ان کے پیچھے عام شرکائے محفل کی نشستیں رہتی تھیں لیکن اب یہ امتیاز ختم ہو چکا ہے کچھ برسوں پہلے تک مشاعروں میں بعض شعراء بہ حالت نشہ شریک رہا کرتے تھے لیکن میں نے ایسے شاعروں کو بھی دیکھا ہے جو مائیک کے پیچھے کھڑے ہو کر کلام سنانا چاہتے تھے میں نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جو لڑکھڑاتے ہوئے شہ نشین تک پہونچ جاتے اور پھر مشاعرے کے اختتام تک سوتے رہتے۔ اردو ہال کے ایک مشاعرہ میں علی سردار جعفری کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیلا جو جیدر تو حاصلِ مشاعرہ رہا۔ مشاعروں کے تعلق سے

بہت سے واقعات ہیں جو سرِ محفل بھی ظہور پذیر ہوئے اور مشاعروں کے آغاز سے پہلے اور بعد بھی ۔۔۔ ابن احمد تاب کے ساتھ میں نے بہت سے مشاعرے پڑھے ہیں لیکن میں نے شاید ہی کسی مشاعرہ میں بغیر نشہ کیے دیکھا ہو۔ لیکن تاب صاحب نے کبھی بھی مشاعرہ خراب نہیں کیا مشاعروں میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی کہ جو مشاعروں کے ناکام ہونے کا باعث رہی ہو۔ میں نے اکثر دفعہ دیکھا ہے کہ مدیر ماہنامہ صبا سلیمان اریب کے ساتھ وہ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے جب یہ دونوں جھومتے جھامتے مشاعرہ گاہ میں آجاتے تو ساری محفل میں جان پڑ جاتی۔ سلیمان اریب ہمارے شہر کے بہت مقبول شاعر تھے بار بار اُن سے کلام سامعین سننا چاہتے تھے یہی حال ابن احمد تاب کا بھی رہتا تھا سلیمان اریب اپنے مخصوص ترنم میں کلام سناتے تھے۔ غزل سے پہلے لازماً کچھ رباعیاں سناتے تھے خاص طور پر اس رباعی کی فرمائش کی جاتی۔

پھر حافظ و غالب کو جوانی دیدوں ۔ خیام کو پھر قالبِ ثانی دیدوں
اک پل کے لیے میں جو خدا بن جاؤں ۔ دنیا کو بس انگور کا پانی دے دوں

ابن احمد تاب کے ترنم میں بلا کا سوز تھا پُر اثر دل کو چھونے والا ترنم تھا۔ بہت عمدہ غزلیں کہتے تھے ہمارے شہر کے مقبول ترین شاعر تھے جو شہر کے ہر بڑے مشاعرہ میں مدعو رہتے تھے اس دور میں صبا کے آفس کمرہ نمبر ۷ میں شعراء کا جمگھٹا رہتا تھا صبا کے دفتر پر مخدوم محی الدین بھی کبھی کبھی آتے تھے شاہد صدیقی، وحید اختر، قمر ساحری، شاذ تمکنت، عزیز قیسی

کنول پرشاد کنول کے علاوہ شمس الدین تاباںؔ، امان ارشد اور س۔ ا عشرت کا بھی آنا جانا رہتا۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے جانے سے پہلے اکثر دفعہ شعراء وہاں جمع رہتے۔ ابن احمد تاب کو میں نے کسی ایک مشاعرہ میں بھی تنہا نہیں دیکھا سلیمان اریب اور ابن احمد تاب ایک ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے مجھے یاد ہے کہ ۴۲ برس پہلے اُردو ہال میں شاعروں، ادیبوں کی امداد کے لیے مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کے داعی شمس الدین تاباںؔ اور ابن احمد تابؔ تھے اس مشاعرہ میں مخدوم محی الدین صاحب کی غزل کا یہ مصرعہ بطور طرح دیا گیا تھا۔

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی دردِ غم کا بیاں دوستو

اس مشاعرہ میں شہر کے بہت سے شاعروں نے شرکت کی تھی۔ میں بھی مدعو تھا میں نے بھی طرح میں غزل سنائی تھی۔ اس مشاعرہ کے بعد ادبی ٹرسٹ کے قیام کی راہ ہموار ہوگی۔ ابن احمد تاب نے اپنی حیات تک ادبی ٹرسٹ کے ہر مشاعرہ میں شرکت کی۔ ان کا انتقال ۱۹۷۳ء ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ادبی ٹرسٹ نے ان کا مجموعہ کلام اہتمام سے شائع کیا۔ اس کتاب کے ساتھ ساتھ استادِ سخن اوج یعقوبی صاحب کا مجموعہ کلام گرفتِ نظر بھی شائع ہوا۔ حیدرآباد میں ہر دور میں ملک کے صفِ اول کے شاعروں کو مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ میں نے جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، منور لکھنوی، آنند نارائن ملاؔ، نریش کمار شادؔ، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، شان الحق، قتیل شفائی کے علاوہ تقریباً تمام ترقی پسند شاعروں کے ساتھ مشاعرے پڑھے ہیں جن میں قابلِ ذکر فیض احمد فیضؔ، فراق گورکھپوری، مجروح سلطان پوری، ساحر

لدھیانوی، جگن ناتھ آزاد، جاں نثار اختر، اختر الایمان، علی سردار جعفری کیفی اعظمی کے علاوہ شکیل بدایونی، فنا نظامی وغیرہ ہیں ـــــــــ

پاکستان کے شعراء احمد فراز، جون ایلیا، حمایت علی شاعر وغیرہ کے ساتھ بھی مشاعروں میں مدعو رہا ہوں ـــ ابن احمد تاب اگرچہ پرانے شہر میں رہتے تھے لیکن زیادہ تر وہ نئے شہر کے شاعروں کے ساتھ دکھائی دیتے تھے ابن احمد تاب کو ادارہ سیاست کی بھی سرپرستی حاصل تھی سیاست میں ان کی غزلیں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں ۔ ابن احمد تاب کے مجموعۂ کلام کی کتابت و اشاعت میں میں نے بھرپور تعاون کیا تھا اُن کے انتقال کے بعد ان کا مجموعۂ کلام شائع ہوا ۔ ان کا کلام مختلف بیاضوں میں اور مختلف اوراق کی شکل میں اِدھر اُدھر رکھا ہوا تھا میں ۔ جگر صاحب کی ہدایت پر اُن کے گھر جاتا اور اُن کے بڑے بیٹے کے تعاون سے غزلیں جمع کرتا رہا ۔ مجموعہ میں ابن احمد تاب کا منتخب کلام شائع ہوا ہے بہت ممکن ہے اس مجموعہ کے علاوہ کچھ اور کلام بھی ان کے ورثار کے پاس ہو ۔ ابن احمد تاب پرانے شہر کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے ۔ میں نے پرانے شہر کے کئی مشاعروں میں انھیں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے اُس دور کے مقبول شاعر تھے بزم حیون کے مشاعروں میں خاص طور پر شرکت کرتے تھے بزم حیون کے مشاعروں میں مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی کے علاوہ سلیمان اریب نے بھی شرکت کی ہے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ابن احمد تاب کو بہت چاہتے تھے اسی طرح مولوی حبیب الرحمن اور ڈاکٹر حسینی شاہد بھی ان کے قدر دانوں میں شامل تھے اُس دور کے تمام مشاہیر اردو کو ابن احمد تاب کی

شاعری نے متاثر کیا۔ ایوانِ اردو اور انجمن ترقی اردو کے ہر مشاعرہ میں ابن احمد تاب موجود رہتے۔ پروفیسر حمید الدین شاہد نے کئی مواقع پر ابن احمد تاب کی سرپرستی کی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ تاب صاحب اس دور کے اساتذۂ سخن نجم آفندی، کامل شطاری، قدر عریضی، تاج قریشی کا احترام کرتے تھے ابن احمد تاب کا شمار ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے ان کی بعض غزلیں بہت زیادہ مشہور رہی ہیں مشاعروں پر چھا جاتے تھے انہیں میں نے تقریباً ہر مشاعرہ میں کامیاب شاعر کی حیثیت سے دیکھا ہے میں نے ابن احمد تاب کے ساتھ اکثر اضلاع کے مشاعرے پڑھے ہیں ایک ہی دیان یا ایک ہی کار میں ہم ایک ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے ہیں ابن احمد تاب محکمہ بلدیہ میں ملازم تھے آفیسروں کی مہربانیوں سے وہ تادم حیات اپنی ملازمت پر باقی رہے ابن احمد تاب مخلص آدمی تھے جونیر شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے تاب صاحب نے ہمیشہ میری پذیرائی کی اچھے لوگ جب اس دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں تو ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی اچھے اچھے لوگوں کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوتے دیکھا ہے لیکن وہ جب یاد آتے ہیں تو مسلسل یاد آتے ہیں۔

ساجد رضوی

(خوش فکر، خوش گلو، جاذب نظر، پُر بہار شخصیت)

میرے دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے مختلف شعبۂ جات سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں سے میری رسم و راہ ہے۔ بے شمار شاعروں سے روابط ہیں لیکن ایسے شعراء جو میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں میرے ہم خیال میرے ہم جلیس اور دل سے چاہنے والے تھے ان میں ایک ناقابل فراموش شخصیت ساجد رضوی کی بھی ہے ساجد رضوی نہایت خوبصورت، مردانہ حسن کا شاہکار تھے۔ بہترین غزل گو ہونے کے علاوہ سحر آگیں پُر اثر ترنم میں کلام سُناتے تھے۔ انہوں نے مرثیے اور نوحے بھی لکھے ہیں بے داغ لباس اعلیٰ درجہ کی شیروانی سفید یا چائے زیب تن کیئے ہوئے رہتے۔ محمدہ جناح کیاپ پہنتے تھے۔ ساجد رضوی اپنے دور کے مقبول ترین شاعروں میں سے ایک تھے میں نے اُن سے ہر غزل ترنم میں سُنی ہے علامہ نجم آفندی کے شاگردوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے انہیں میر ثامن علی تبسماں اور علامہ ناصر زیدی

سے بھی شرفِ تلمذ حاصل رہا۔ علامہ نجم آفندی کے جن قریب ترین شاگردوں سے میں زیادہ واقف ہوں اُن میں خاور نوری، قائم جعفری، ڈاکٹر صادق نقوی اور اختر عزیزی قابلِ ذکر ہیں مگر ان تمام میں ساجد رضوی کی ایک مخصوص پہچان تھی۔ اُس دور میں (یعنی زائد از ۲۵ برس پہلے) وہ حیدرآباد کے ہر بڑے مشاعرہ میں کلام سناتے تھے۔ اُس دور کے بیشتر اساتذہ سخن میں حضرت حیدر یار جنگ، مولانا کامل شطاری، علامہ قدر عریضی، حضرت تاج قریشی، سیف حموی، احمد علی شباب وغیرہ ساجد رضوی کی شاعری و شخصیت سے متاثر تھے۔ ساجد رضوی بھی ان اساتذہ کرام کی دل و جان سے قدر کرتے تھے ان کا احترام کرتے تھے ان اساتذہ سخن کی محفلوں میں شرکت کرنے سے مشاعروں کی تہذیبی روایات سے واقفیت حاصل ہوتی تھی۔ تمام اساتذہ سخن آپس میں شیر و شکر کی طرح رہتے تھے ایک دوسرے کے کلام کی بھی کھول کر داد دی جاتی تھی۔ اس دور میں علامہ نجم آفندی کی زیرسرپرستی سفینۂ ادب کے مشاعروں نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ حضرت قدر عریضی کی سرپرستی میں قائم کردہ انجمن قدرِ ادب کے مشاعرے بھی اپنی آپ مثال تھے پھر مولانا کامل کے دولت خانہ پر ہر ماہ ہونے والے بزم کامل کے مشاعروں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان تمام محفلوں میں اساتذہ سخن موجود رہتے تھے ہر استاد کے کچھ نمائندہ شاگرد بھی اپنا کلام سناتے تھے جن کی تمام اساتذہ سخن حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ میں علامہ قدر عریضی کا بھی شاگرد رہا ہوں اور ملک الشعراء اوج یعقوبی کا بھی۔ میں قدرِ ادب کا معتمد عمومی

بھی رہ چکا ہوں اس کے علاوہ ان دنوں اتحادِ شعراء کے نام سے ایک نمائندہ انجمن قائم کی گئی تھی جس سے شہر کی تقریباً ۲۲، ۲۳ انجمنوں کا الحاق تھا میں اس انجمن کا جنرل سکریٹری تھا اور حضرت علامہ نجم آفندی اس انجمن کے صدر نشین تھے جس کے مشاعرے نہایت پابندی کے ساتھ حضرت قدر عریضی کے دولت خانے پر ہوا کرتے تھے جس میں مولانا کامل شطاری، حضرت علامہ نجم آفندی، حضرت تاج قریشی، حضرت قدر عریضی، سیف حموی، اوج یعقوبی صاحب خواجہ شوق صاحب اور شہر کے نمائندہ نوجوان شعراء بھی شرکت کرتے تھے۔ اس زمانے میں یوں تو شہر میں کئی اور انجمنیں تھیں لیکن زیادہ تر شہرہ ان ہی انجمنوں کا تھا جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔
پرانے شہر میں شہر ادب اور بزم جیون کے بھی بڑے چرچے رہے شہر ادب کے سربراہ فرید مبین تھے اور بزم جیون کے جیون لعل جیوت۔ بزم جیون میں شہر کے تمام مشہور شعراء شرکت کرتے تھے۔ میری معتمدی کے زمانے میں مخدوم محی الدین صاحب نے بھی ایک مشاعرے کی صدارت کی تھی۔ لیکن اس طرح کی محفلیں رفتہ رفتہ کم ہوتی گئیں۔ ان کی جگہ نئی انجمنوں نے کام کرنا شروع کیا۔ اس وقت بھی ہمارے شہر میں نئی شعری و ادبی انجمنیں زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں حالات کے لحاظ سے ادبی انجمنوں کی سرگرمیاں اپنے اپنے انداز سے جاری ہیں پہلے پرانے شہر میں ادبی انجمنوں کی جانب سے صرف مشاعرے ہوتے تھے ادبی جلسے نہیں ہوتے تھے اکثر مشاعرے طرحی ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے ہر استادِ سخن کے پڑھنے کا انداز دوسرے استادِ سخن سے جدا ہوتا تھا۔ علامہ

نجم آفندی تحت میں کلام سناتے تھے اور کوئی خاص شعر ہو تو کئی جہاں جہاں حضرات ہیں سُنیئے۔ مولانا کامل شطاری کبھی کبھی تحت میں شعر سناتے تھے علامہ قدر عریضی ہر غزل ترنم سے سناتے تھے ان کا ترنم پُر اثر ہوتا تھا اور آواز بابٹ دار تھی حضرت سیف حموی بھی ترنم میں کلام سناتے تھے حضرت تاج قریشی تحت اللفظ میں کلام سناتے تھے اس دور کے اساتذہ سخن میں علامہ نجم آفندی، حضرت قدر عریضی، مولانا کامل، تاج قریشی اور سیف حموی کے رکھ رکھاؤ پر بھی خاص نظر رکھتا تھا استاد شاعر کا انداز بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا لیکن جہاں تک آداب گفتگو، آداب محفل کی بات ہے تمام اساتذہ تہذیبی اقدار کے مکمل ترجمان بنے رہتے تھے۔ ان بزرگوں کی محفلوں میں شرکت کرنے والے بعض شاعر آج بھی اپنی اپنی محفلوں میں آداب محفل کا خیال رکھتے ہوئے قدیم تہذیبی اعلیٰ روایات کے تحفظ و ترویج کے لیے سرگرم عمل رہا کرتے ہیں۔ ساجد رضوی صرف پرانے شہر کے ہی مشہور شاعر نہیں تھے بلکہ نئے شہر کے بیسیوں مشاعرے پڑھے ہیں، کئی کل ہند مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور ادارہ ادبیات اردو کے مشاعروں میں خصوصیت کے ساتھ مدعو کیے جاتے تھے ساجد رضوی جتنے پرانے شہر کی شعری و ادبی ماحول میں مقبول تھے اتنے ہی نئے شہر کے شعری و ادبی ماحول میں پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے اکثر مشاعروں میں ساجد رضوی کا اور میرا ساتھ رہا ہے اُس زمانے میں ساجد رضوی کی ایک غزل کا مصرعہ ”ایک شباب آتا ہے ایک شباب جاتا ہے“

کافی مشہور تھی۔ مشاعروں میں اس غزل کی فرمائش کی جاتی تھی ساجد رضوی
کو علم عروض پر مہارت حاصل تھی علامہ نجم آفندی سے تمام شعری رموز سے
واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اُس زمانے میں وہ علامہ ناصر زیدپوری کے بھی
قریب تھے ساجد رضوی اپنی عمر کے آخری دنوں میں شاید ۲۰ سال تک
معظم جاہ شجیع کے دربار سے وابستہ رہے۔ ساجد رضوی خوش گلو شاعر
تو تھے ہی لیکن خوش لباس، خوش مزاج اور خوش اخلاق اور مہذب
انسان تھے میرے بہت ہی قریبی دوستوں میں سے تھے شعر و ادب کے
معاملات میں ساجد رضوی کبھی بھی نزاعی شاعر نہیں بنے رہے تمام
شاعروں سے ان کے اچھے خاصے روابط تھے ساجد رضوی کی شاعرانہ
حیثیت سے ان کے تمام ہم عصر شعراء متاثر تھے ان کی قدر و قیمت کا
انہیں اندازہ تھا وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے مطمئن تھے انہوں
نے کبھی بھی اپنے دوستوں کو ناراض نہیں کیا۔ سب سے مل جل کر رہتے تھے
ساجد رضوی محفل کے آدمی تھے مشاعروں میں چاق و چوبند رہتے تھے ان
کا شاعرانہ لب و لہجہ نہایت شگفتہ، شائستہ و پُر اثر ہوتا تھا یہ
نہیں ان کے کونسے شاگرد ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا اندازہ ہے
کہ وہ کچھ مخصوص شاگردوں کے استاد تھے میری شاعری کے ابتدائی دور
میں عظمت عبدالقیوم، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، روحی علی اصغر اور بیانہ حیدر
کا عالم ایک ساتھ آتا تھا۔ ایوانِ اردو کی محفلوں میں ان شاعرات کا
کلام سننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ روحی علی اصغر کو ادبی حلقوں میں روشناس

کرونے کا سہرا ساجد رضوی کے سر جاتا ہے روحی علی اصغر، عظمت عبدالقیوم یا نو طاہرہ سعید اور نازہ حیدر کی طرح نہایت شائستہ شاعرہ تھیں ادارہ ادبیاتِ اردو میں اُن دنوں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں سے جب مشاہیر اردو حیدرآباد آتے تو ڈاکٹر زور ان محفل شعر آراستہ کرتے تھے اسی طرح مولوی حبیب الرحمٰن بھی اردو ہال میں ادبی محفلوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ساجد رضوی ۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء کو محلہ فرحت نگر میں ایک معزز سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دارالشفاء ہائی اسکول میں ہوئی۔ ان کے چھ شعری مجموعے تجلیاں، سجدے، شمع حرم جلوے، سجدۂ اخلاص اور جانِ غزل شائع ہوئے ہیں مشاعروں کے کامیاب شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے شائقین شعر و ادب پوری توجہ کے ساتھ ان کا کلام سنتے تھے۔ ساجد رضوی کے قریب ترین دوستوں میں میرے علاوہ ناصر کرنولی، رشید اختر، صادق نقوی بھی تھے اُن کے اور بھی قریبی دوست ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ ساجد رضوی کے مراسم صرف شاعروں سے ہی تھے ساجد رضوی نے شہر کے تمام علمی و ادبی حلقوں سے پوری طرح واقف ہی نہیں تھے بلکہ ان کے سربراہوں سے بھی اُن کے مراسم تھے اگر کوئی شخص مجھ سے یہ خواہش کرے کہ میں اپنے بہترین دوستوں کی فہرست مرتب کردوں تو ساجد رضوی کا نام بھی اُس منتخب فہرست میں شامل رہے گا۔

محی الدین جیلانی

(تمائش سوسائٹی کی فعال شخصیت ہمدرداستان)

بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو غیر محسوس طریقے سے دل و دماغ میں جاگزیں ہوجاتی ہیں اور جن کی اچھائیاں اور خوبیاں نیکیاں اور کرم فرمائیاں جسم و جاں کا ایک حصہ بن جاتی ہیں جن کی پُرکشش شخصیت مجبور کرتی ہے کہ ان کے قول و فعل اور ان کی حرکیاتی و فلاحی طرزِ حیات سے اپنے والہانہ غیر مرئی رشتوں کو ذہن و فکر کے وسیع دائروں میں محفوظ رکھیں۔ خوش اخلاقی مروت پسندی، نیک نفسی اور اعلیٰ کردار کی عظمتیں اس طرح کے لوگوں کی ہر حرکت سے عیاں ہوتی جاتی ہیں اس طرح کے لوگوں سے ملنے پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ واقعتاً زندگی کے مختلف رنگ ہیں جو مہذب معاشرہ کی ترتیب و تزئین کے لیے زرفشاں رہا کرتے ہیں۔ انسانی رشتوں کو محسوس کرنے والے لوگ اپنی شرافت

اور اپنی خوبیوں کی وجہ سے معاشرہ کے لیے ایک ایسی روشنی بن جاتے ہیں جن کے وجود سے آس پاس کا سارا ماحول جگمگاتا رہتا ہے اسی طرح کے اجالے بانٹنے والی شخصیتوں میں محی الدین جیلانی بھی شامل تھے جو خاص طور پر نمائش سوسائٹی کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے محی الدین جیلانی سے میرا اسم ـــ کا تعلق شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں کے آغاز کے زمانے سے ہی رہا ۔ شنکر جی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعرے گذشتہ ۲۹ برسوں سے عالیشان پیمانے پر منعقد کئے جا رہے ہیں ۔ حیدرآباد میں ادبی ٹرسٹ کے کل ہند مشاعروں کے بعد شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعرے ساری اردو دنیا میں شہرت رکھتے ہیں ۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ میں شنکر جی میموریل سوسائٹی کے پہلے مشاعرہ سے تقریباً ۲۰ مشاعروں کی سرگرمیوں سے عملاً وابستہ رہا ۔ (اب بھی ضرورتاً معاون رہتا ہوں) ۔ جناب عابد علی خاں صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب کی نمائش سوسائٹی کی مقبول ترین شخصیت شنکر جی سے مثالی دوستی تھی شنکر جی جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے انہوں اردو سے گہری وابستگی رکھی مخدوم محی الدین صاحب اور میر حسن صاحب ان کے ہم جماعت تھے ۔ شنکر جی ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں بہ پابندی شرکت کرتے تھے ۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے نمائش میدان میں ہوا کرتے تھے ۔ شنکر جی کے انتقال کے بعد عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب کی شخصی دلچسپی سے شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں کی بنیاد

پڑی۔ ان دو محترم شخصیتوں کے ذہن میں یہ بات پیوست ہو گئی تھی کہ دلی میں ہونے والے شنکر شاد کل ہند مشاعروں کی طرح ایک غیر مسلم محب اردو کے نام سے حیدرآباد میں سالانہ کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا جائے۔ شنکر جی مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں سب سے زیادہ کارکرد شخصیت محی الدین جیلانی کی تھی۔ نمائش سوسائٹی کے دیگر اراکین سریندر ریڈی (فرزند شنکر جی) اور وینکٹ ریڈی ان کے معاون رہتے۔ پنڈت جی (مشرا صاحب) کے علاوہ دیگر ارکان کا بھی تعاون حاصل رہتا ہے۔ شنکر جی مشاعروں کے آغاز سے لے کر محبوب حسین جگر صاحب کے انتقال تک مشاعروں کی تمام تر صورت گری "سیاست" آفس میں ہوتی تھی۔ عابد علی خان صاحب کی زندگی تک مشاعروں کے اعلیٰ سطح کے انتظامات اور مہمان و میزبان شعراء کا انتخاب عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کیا کرتے تھے جن میں میرا مشورہ بھی شامل رہتا۔ شنکر جی مشاعروں کی متعلقہ فائیل میرے پاس رہتی تھی جگر صاحب کی نگرانی میں شاعروں سے مراسلت کی جاتی اور مدعوئین کی فہرستیں تیار کرنا۔ مشاعروں کے اشتہارات وغیرہ کی ابتدائی صورت گری میرے ذمہ رہتی تھی۔ تمام امور کو عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب قطعیت دیتے تھے۔ لیکن محی الدین جیلانی کو باخبر رکھتے ہوئے شنکر جی مشاعروں کی وساطت سے محی الدین جیلانی سے میرے مراسم کا آغاز ہوا۔ مشاعروں کے

ابتدائی زمانے میں بلکہ ۲۰ برس تک مہمان شعراء کی آمد و رفت کے سلسلے میں جیلانی صاحب، سربلند صاحب وینکٹ ریڈی اور کبھی کبھی پنڈت جی اور خواجہ معین الدین بھی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ مشاعروں کی تیاریاں مشاعرہ سے ایک ماہ قبل شروع ہو جاتیں۔ ان مشاعروں میں شعراء کا انتخاب اہم مسئلہ رہتا تھا۔ یہ سارے کام "سیاست" آفس میں انجام پاتے رہے۔ جناب عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب کی نگرانی میں۔ محی الدین جیلانی اور ان کے ساتھیوں نے سارا کام جگر صاحب پر چھوڑ دیا تھا۔ جگر صاحب اور عابد علی خان صاحب شعراء کے انتخاب میں غیر معمولی دلچسپی لیتے۔ ان دونوں شخصیتوں کی دلچسپی کی وجہ شنکر جی مشاعرہ عالمی مشاعروں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ محی الدین جیلانی نہایت متحرک اور کارکرد شخصیت کی حیثیت سے نمائش سوسائٹی کے ارکان میں مشہور و مقبول تھے۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ شنکر جی مشاعروں کے سلسلے میں میری بے لوث خدمات اہم رہی ہیں۔ جیلانی صاحب ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ نمائش سوسائٹی کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں میں ان کا بڑا اثر تھا وہ ایک با اثر شخصیت کی طرح سرگرم عمل رہتے تھے۔ جیلانی صاحب شنکر جی میموریل مشاعروں کے کنوینر رہا کرتے تھے۔ مہمان شاعروں اور میزبان شعراء کو مدعو کرنے کے سلسلے میں ضروری امور پر بھی مشورہ

نے تھے۔ صنعتی نمائش کے دوران ہونے والے مشاعرہ کی ذمہ داری مجھے سونپ دیتے تھے۔ شعراء کا انتخاب میرا ہی رہتا ہے لیکن متعلقہ ارکان سوسائٹی کی منظوری کے بعد شعراء کی فہرست کو قطعیت دی جاتی ہے جب تک ہاشم سعید (سپیشل ایڈیٹر سیاست) بقیدِ حیات تھے وہ نمائش کلب کے مشاعرہ کے انعقاد میں شخصی دلچسپی لیتے رہے۔ مشاعرہ کا کنوینر میں ہی رہتا۔ ویسے زائد از ۲۵ برسوں سے مشاعرہ کی معتمدی کے فرائض میں ہی انجام دے رہا ہوں۔ جیلانی صاحب نمائش سوسائٹی کے بیشتر اُردو پروگراموں کو قطعیت دینے میں کلیدی رول ادا کرتے تھے۔ نمائش کے دوران غزلوں کے جتنے بھی پروگرامس ہوتے ہیں جیلانی صاحب کی صلاحیتوں اور ان کی مشاورت سے استفادہ کیا جاتا تھا جیلانی صاحب فوڈ کارپوریشن آف انڈیا میں عہدہ دار رہ چکے تھے۔ نمائش سوسائٹی سے ان کی وابستگی کی وجہ سے اُردو پروگرامس بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے۔ جیلانی صاحب کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے بلا تخصیص مذہب و ملت وہ سب کے ساتھ کشادہ دلی اور کھلے ذہن کے ساتھ ملا کرتے تھے۔ میں انہیں زائد از ۳۰ برسوں سے جانتا ہوں وہ نمائش سوسائٹی کے لیے ایک اہم اثاثہ تھے جیلانی صاحب اپنی سخت علالت کے زمانے میں بھی نمائش سوسائٹی کی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ جب کبھی ان سے مجھے کوئی کام ہوتا تھا تو نہایت خوش دلی اور دلچسپی کے ساتھ تعاون کرتے تھے

پریسیڈنٹ اردو اسوسی ایشن کے میوزیکل پروگرامس نمائش کے دوران کئی برسوں سے ہو رہے ہیں۔ میں سکریٹری اردو اسوسی ایشن کا بانی جنرل سکریٹری رہا ہوں۔ نہ صرف جیلانی صاحب بلکہ نمائش سوسائٹی کے دیگر متعلقہ اصحاب بھی مجھ سے تعاون کیا کرتے تھے۔ اگرچہ میں نمائش سوسائٹی کا رکن نہیں ہوں لیکن جتنے ارکان موجود ہیں سب کا سلوک میرے ساتھ دوستانہ رہتا ہے۔ جیلانی صاحب ایک خوش مزاج، با اخلاق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کا وجود نمائش سوسائٹی کے لیے نہایت اہم تھا نہایت با اثر شخصیت کے حامل تھے۔ تمام ارکان نمائش سوسائٹی جیلانی صاحب کی عزت کرتے تھے اور ان کے ہر مشورہ کی پذیرائی کی جاتی تھی۔

جیلانی صاحب نہ تو شاعر تھے اور نہ ادیب لیکن انہیں اردو زبان و ادب بلکہ اردو تہذیب سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ ان کی سرشت میں حیدرآبادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نمائش سوسائٹی کی اعلیٰ روایت کی برقراری کے لیے حتی الامکان کوشاں رہتے تھے۔ ان کی شخصی دلچسپی نے نمائش سوسائٹی کے وقار کو بلند کیا۔ جناب عابد علی خاں صاحب اور جگر صاحب، جیلانی صاحب کو بہت چاہتے تھے جیلانی صاحب بھی ان دونوں محترم شخصیتوں کا بے حد احترام کرتے تھے ہر شخص کی ذاتی شرافت ہمیشہ کام آتی ہے اور وہ معاشرہ میں نیک نامی کے ساتھ اپنے شب و روز گذارتا ہے جیلانی صاحب کو بھی میں اس زمرہ میں شامل کرتا ہوں جو ہر وقت معاشرہ میں نیک نامی کے ساتھ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

غوث محمد

(نامور خوشنویس اور خوش طبع انسان)

"دیر آید درست آید" عموماً اُس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی کام عجلت پسندی سے دامن کشاں رہتے ہوئے تاخیر سے سہی بہترین انداز میں تکمیل پا جاتا ہے عام طور پر کاتبین حضرات کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ بر وقت کام نہیں کرتے۔ تساہلی کا شکار رہتے ہیں اہل غرض شاعروں، ادیبوں کے صبر کا امتحان لیتے رہتے ہیں قلم کاروں کو کئی بار اُن کے در پہ دستک دینی پڑتی ہے کبھی اُن کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہے تو کبھی بند۔ کبھی پہلی ہی آواز پر باہر آجاتے ہیں اور کبھی بار بار آواز دینے کے بعد رونق افروز ہوتے ہیں اور کبھی گھر میں رہ کر بھی کہلواتے ہیں کہ گھر پر نہیں ہیں۔ مگر یہ بات تمام کاتبین پر لاگو نہیں ہو سکتی۔ ویسے بھی اچھے فنکاروں کی خدمت سے استفادہ کرنا مقصود ہو تو ان کی رفتار کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے غوث محمد کا شمار پرانے شہر کے نمائندہ کاتبوں میں ہوتا تھا جن کے بارے میں میری ہمیشہ اچھی رائے رہی۔ میں نے غوث محمد

سے اپنے بعض ضخیم مجموعے بھی لکھوائے ہیں اور مختصر منتخب بھی۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے تعاون کیا۔ غوث محمد صاحب نے پہلی دفعہ میرے دوسرے مجموعۂ کلام "زخموں کے گلاب" کی کتابت کی اور نہایت عمدگی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا بہت خوبصورت لکھا جس طرح میں چاہتا تھا ویسا ہی لکھا یہ کیا رشتہ ہے" پھر سفر جاری ہے" لکھوایا انہوں نے میری اور کتابوں صنم تراش، شکن در شکن رشتوں کی مہک، خوشبو کا سفر کی بھی کتابت کی۔ نثری کتابوں میں عظمت عبدالقیوم فن اور شخصیت اور عظمت خیابان (عظمت عبدالقیوم) کی بھی کتابت کی۔ مجھے غوث محمد صاحب نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ وقت کی پابندی نہ کرتے ہوئے صرف مسکرا کر رہ گئے ہوں۔ غوث محمد صاحب کا مکان تالاب کٹہ (امان اللہ خان نگر) میں واقع ہے میں اکثر دفعہ اُن کے ہاں اتوار کے دن ہی جایا کرتا تھا جیسے ہی میں آواز دیتا وہ باہر آتے اور اپنی مخصوص مخلصانہ مسکراہٹ کے ساتھ ملاقات کرتے اور اپنے دیوان خانہ میں لے جا کر بٹھاتے۔ فی الفور چائے کے لیے آواز دیتے۔ ان کا کوئی ایک بیٹا چائے لے کر آتا۔ کبھی کبھی وہ مجھے سگریٹ بھی پلاتے تھے حالانکہ میں سگریٹ کا عادی نہیں ہوں۔ تفریحاً کبھی کبھی پی لیتا ہوں وہ بھی دوسروں سے مانگ کر۔ غوث محمد صاحب کتابت شدہ صفحات حوالے کرنے اور کتابت کے آخری مراحل میں ۲، ۳ گھنٹوں تک بیٹھ کر تکمیل شدہ کام پائے تکمیل کو پہونچاتے تھے۔ کبھی کبھی غوث محمد صاحب تن آسانی سے کام نہیں لیا۔ میں سمجھا کہ وہ تساہلی سے کام لے رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ

اتنا اہم کام انہیں مل جاتا کہ وہ اُس موقتی اہم کام کو اہمیت دیتے۔ ایسا اقدام ان کا جھجھک رہتا۔ جب وہ تفصیل بتلاتے تو میری موقتی خفگی کافور ہو جاتی۔ غوث محمد صاحب کی ساری کتابت ایمانداری اور فرض شناسی کا اعلیٰ نمونہ رہتی تھی۔ کبھی بھی انہوں نے عجلت میں کام نہیں کیا۔ وہ وقت ضرور لیتے لیکن عمدہ اور نفیس کام کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے خیال آتا ہے ان سے میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ رہنمائے دکن سے وابستہ تھے۔ پھر وہ سیاست میں کام کرنے لگے اور انہوں نے سیاست کے بعد اپنے گھر پر ہی کتابوں کی کتابت کا کام جاری رکھا۔ بیسیوں کتابیں لکھیں اور اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا۔ غوث محمد صاحب حیدرآباد کے صف اول کے خوشنویسوں میں سے ایک تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۲/۱۰ برس پہلے ان کی خوشنویسی کے شاہکاروں کا اُردو گھر میں زیر اہتمام ادارۂ سیاست نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ غوث صاحب کو میں نے سائیکل چلاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ غوث محمد صاحب نے ۱۹۳۶ء میں سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع عثمان آباد میں پیدا ہوئے۔ خوشنویسی کا ذوق انہیں ورثے میں ملا۔ ان کے والد جناب خیر اللہ صاحب خطاطی کے فن میں مہارت رکھتے تھے غوث محمد صاحب نے اس فن کے رموز و نکات اپنے والد سے سیکھے ۱۹۵۲ سے کتابت کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ غوث محمد صاحب کے سات بیٹے ہیں نفضل محمد خان، افضل محمد خان، فیصل محمد خان، اجمل محمد خان، عرفان محمد خان سہیل محمد خان اور اقبال محمد خان۔ غوث محمد کے دوسرے بیٹے افضل محمد خان

بہترین کاتب ہیں جو اخبار سیاست سے بھی وابستہ رہے ۔ ادھر کچھ عرصہ سے جمال مارکٹ (مچھلی بازار) میں پرنٹرز شادی کے دعوت ناموں کی کتابت کرتے ہیں اور وہ اپنے ذاتی کاروبار سے مطمئن ہیں غوث محمد کو شعر و ادب سے بے حد لگاؤ تھا اکثر ادبی محفلوں میں شرکت کرتے تھے مشاعروں میں موجود رہتے تھے غوث محمد صاحب نے میری کتابوں کے علاوہ حیدرآباد کے کئی شاعروں ادیبوں کی کتابوں کی کتابت کی ہیں اپنے بعض دوستوں کی کتابوں کی کتابت کے لیے انہیں زحمت دیتا رہا ۔ غوث محمد بے حد مخلص، بے حد شریف اور بے حد پاک و صاف آدمی تھے کتابت کی اجرت کے سلسلے میں ان کا بہت شفاف ریکارڈ رہا ہے کبھی بھی انہوں نے کسی سے بھی زائد اجرت نہیں لی ۔ کبھی اجرت طے کرنے میں زیادتی نہیں کی ۔ معقولیت پسند انسان تھے معاوضہ کا تعین نہایت واجبی کرتے تھے خاص طور پر شاعروں، ادیبوں سے ان کا حسن سلوک مثالی رہا ۔ غوث محمد صاحب کبھی روپیہ پیسے کے پیچھے دوڑتے ہوئے دکھائی نہیں دیئے ۔ وہ کچھ اس قدر اعلیٰ ظرف شریف انسان تھے کہ قلمکار ان کے گرویدہ رہتے ۔ وہ کسی کو کبھی مایوس نہیں کرتے تھے حسب منشاء کام انجام دیتے ۔ ۔ ۔ صاحب سے میں نے جتنی بھی کتابیں لکھوائیں انہوں نے کتابت کی پیشگی اجرت کا مطالبہ نہیں کیا ۔ ضرورتمند رہنے کے باوجود وہ صبر و استقلال سے کام لیتے تھے حیدرآباد کے تمام ادبی حلقوں کے قلمکاروں ۔ ۔ ۔ ۔ رہتے تھے تمام احباب ان سے خوش دلی کے ساتھ ملتے تھے غوث محمد صاحب مسکراہٹ سے تبادلہ کرتے ہوئے کسی

خاص بات پر قہقہہ بھی لگاتے تھے دوستوں اور جان پہچان والوں سے کھل کر ملتے تھے سب کے سب ان کے دوست تھے کوئی بھی ان سے ملنے و الا نسر و نازگی محسوس کرتا ثقافتی اردو بورڈ کے تعاون سے جلیل پاشاہ صاحب صدر کل ہند تعلیمی کمیٹی کی زیر نگرانی قائم کردہ مرکز خوشنویسی نامپلی میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں ادارہ ادبیات اردو کے مرکز خوشنویسی کے بھی صدر مدرس تھے غوث محمد صاحب نے محکمہ اطلاعات میں بحیثیت کاتب کام کیا سیاست اخبار کے مختلف کالمس کی سرخیاں (عنوانات) تحریر کیا کرتے تھے تقریباً ہر سال ان کی خدمات سیاست کو حاصل رہیں کتابت کے کئی شاہکار ان کی یادگار ہیں غوث صاحب نے بے شمار مذہبی کتابیں لکھی ہیں شہر کے تقریباً تمام شاعروں، ادیبوں کے علاوہ علماء و مشائخین سے بھی ان کے مراسم تھے وہ ایک اعلیٰ درجہ کے فن کار اور نفیس انسان تھے مہذب معاشرہ کی نامور شخصیتوں میں شمار کیے جاتے تھے طبیعت میں بے حد انکساری تھی میری اُن سے بیسیوں ملاقاتیں رہیں کئی ادبی جلسوں اور مشاعروں میں ہم ملتے رہے غوث صاحب سب کے ساتھ کھلے ذہن سے ملتے تھے انہیں میں نے کسی وقت بھی کسی دوست سے خفا ہوتے ہوئے یا کسی شاعر و ادیب کی شکایت کرتے ہوئے نہیں دیکھا نہایت نیک صفت انسان تھے دوسروں کو بھی اچھی نظروں سے دیکھتے تھے میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کے گھر کا ماحول مشرقی تہذیب کا آئینہ دار ہے تمام افراد خاندان شائستگی کا مظہر ہیں یہ دراصل غوث محمد صاحب کی تربیت کا کرشمہ ہے کہ ان کے گھر کے سب

ذگ آداب زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہے ہیں غوث محمد صاحب اگرچہ نہایت سنجیدہ انسان تھے ان کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مزاح کا بھی دخل رہا کرتا تھا طنز انھوں نے نہ کسی پیر کیا نہ ہی کسی دوست کو اپنے مزاح کا شکار بنایا۔ مزاحیہ جملوں اور لطائف سے محظوظ ہوتے تھے یار باش انسان تھے تمام شاعر و ادیب اُن سے خلوص رکھتے تھے غوث صاحب نے بھی ہمیشہ خلوص کا مظاہرہ کیا۔ تصنع ان کے مزاج کا کبھی حصہ نہ بن سکا۔ وہ جتنے تھے اتنے ہی پیش ہوتے رہے۔ اعلیٰ درجہ کے فن کار ہونے کے باوجود غرور و تکبّر، خودستائی سے کوسوں دور رہے۔ اپنے شاگردوں کی دوستانہ ماحول میں تربیت کرتے تھے غوث محمد صاحب کا ادارۂ سیاست سے گہرا رشتہ تھا وہ عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب کی سرپرستی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے چونکہ آدمی خاندانی تھے اس لیے اپنے محسنوں کے احسان کو یاد رکھتے تھے مختصر علالت کے بعد غوث صاحب کا ۵ راکتوبر ۱۹۹۶ء کو انتقال ہوا۔ غوث محمد صاحب سے مجھے قلبی لگاؤ تھا اُن کے انتقال کی خبر سے مجھے بے حد صدمہ ہوا تھا سچ ہے رہے نام اللہ کا۔ اچھے لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اپنے بے مثال کارناموں، اپنی بے مثال دوستی اور بے مثال شرافت کی وجہ سے۔ غوث محمد صاحب ہرگز ایسے نہیں جنھیں بھلایا جا سکے۔ غوث صاحب جب تک زندہ رہے میرے دل میں رہے اب نہیں ہیں مگر اُن کی یادیں اُن کے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

بوگس حیدرآبادی

(بامروت شخص طنز و مزاح کے منفرد شاعر)

حیدرآباد میں جہاں سنجیدہ شاعروں نے اپنی شاعرانہ عظمتوں کا احساس دلایا ہے وہیں طنز و مزاحیہ شاعروں نے بھی کچھ اس طرح کی مزاحیہ طنزیہ شاعری کی ہے کہ انہیں شعری و ادبی حلقے کبھی بھول نہیں سکتے اور جن کا نام سنجیدہ شاعروں کی طرح دستاویزی حیثیت رکھتا ہے ہمارے شہر کے طنزیہ و مزاحیہ شاعروں میں جہاں نذیر دہقانی، علی صاحب میاں سلیمان خطیب، سرور ڈنڈا اور اضلاع کے شاعروں میں مسافر نلگنڈوی، ہگلی نلگنڈوی جیسے اہم شاعروں کی شاعرانہ عظمت کو خراج پیش کیا جاتا ہے وہیں ہم بوگس حیدرآبادی کو نہیں بھلا سکتے۔ ہر مزاحیہ شاعر کا ایک علحدہ انداز رہا ہے جو لوگ ان مزاحیہ و طنزیہ شاعروں کی شاعری سے واقف ہیں وہیں وہ یقیناً ہر شاعر کے بارے میں اپنی ایک علحدہ رائے رکھتے ہوں گے اس لیے کہ ہر شاعر کا لب و لہجہ دوسرے شاعر سے الگ رہتا ہے۔

بوگس حیدرآبادی اپنے دور کے شاعروں میں اپنی پوری پہچان کے ساتھ اپنے فن کا احساس دلاتے رہے۔ میں نے بوگس حیدرآبادی کو بے شمار مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے بے حد مقبول رہے۔ بوگس حیدرآبادی کا اسلوب شاعری ان کی بعض مخصوص غزلوں کی وجہ سے زیادہ پسند کیا جاتا رہا۔ بوگس حیدرآبادی کی اکثر غزلیں مرزا غالب کی زمین میں ملیں گی۔ بوگس حیدرآبادی مرزا غالب کے منتخب مصرعوں پر گرہ لگایا کرتے تھے ایک مصرعہ غالب کا ہوتا ایک بوگس کا۔ جیسے

"داڑھی رکھ کر بھی عاشقی بوگسؔ ٭ شرم تم کو مگر نہیں آتی"

بوگس نے ہمیشہ غالب کے مصرعہ ثانی پر گرہ لگائی۔ غالب کے سنجیدہ مصرع پر بوگس کا مزاحیہ مصرع بہت لطف دیتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بوگس اپنا مصرع تحت میں پڑھتے تھے اور غالب کا ترنم میں۔ بوگس کا ترنم شاعرانہ تھا جو دل پذیر و پُراثر بھی تھا۔ بوگس حیدرآبادی سے میرے شاعرانہ مراسم تقریباً ۳۰ برس رہے ہوں گے۔ حیدرآباد کے مشاعرے ہوں کہ اضلاع کے مشاعرے یا کل ہند مشاعرے ہوں ہم نے ساتھ ساتھ مشاعروں میں کلام سنایا ہے مشاعروں کی کامیابی کے لیے منتظمین مشاعرہ بوگس کو مدعو کرنے کے لیے مجبور تھے حالانکہ سنجیدہ مشاعروں میں مزاحیہ شاعروں کو مدعو کیے جانے سے گریز کیا جاتا ہے لیکن بوگس اس طریقہ کار سے مستثنیٰ رہے۔ بوگس حیدرآبادی میرے قریبی دوست تھے اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن ہمارے مراسم بے تکلفانہ تھے۔ بوگس حیدرآبادی کو بہت سے لطیفے یاد تھے اکثر دفعہ

مشاعروں کے سلسلے میں سفر کے دوران وہ اپنے لطیفوں سے محظوظ کیا کرتے تھے
یوگس حیدرآبادی کا پیشہ درس و تدریس رہا۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اردو کیا
اردو آرٹس کالج (آر دو ہال) سے بی اے کیا تھا جن کے ہم جماعت بزم عثمانیہ جدہ
کے بانی و فعال شخصیت عارف قریشی ہیں۔ یوگس اپنے دور کے مختلف
مشاعروں میں مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے بھی منتظمین مشاعرہ کے ساتھ تعاون
کیا کرتے تھے انہیں کلچرل پروگرام اور تہذیبی پروگراموں میں دلچسپی رہی۔
یوگس نے حیدرآباد میں عارف قریشی کے زیر اہتمام منعقدہ کلچرل
پروگراموں میں ان کے رفیق کار اور دست راست تھے عارف قریشی اپنے
کالج کے دوستوں میں یوگس سے بہت زیادہ قریب رہے۔ یوگس سے میرے
مراسم بھی گہرے تھے یوگس علحدہ طور پر منعقدہ مزاحیہ مشاعروں کے علاوہ
سنجیدہ مشاعروں میں بھی مدعو رہا کرتے تھے۔ علامہ حیرت بدایونی کے
شاگرد تھے یوگس زندہ دلان حیدرآباد کے ایک اہم رکن تھے زندہ دلان
حیدرآباد کے بعض کل ہند مشاعروں کے معتمد بھی رہ چکے ہیں۔ وہ زندہ دلان
حیدرآباد کے قیام کے زمانے سے اُس سے وابستہ رہے۔ یوگس اور میرا ساتھ
اضلاع حیدرآباد دکن کے مشاعروں میں بھی رہا ہے جیسے پربھنی، ناندیڑ،
گلبرگہ، اورنگ آباد وغیرہ کے یادگار مشاعرے۔ نہایت منکسر المزاج
بہترین دوست، ہمدرد با مروت نیک انسان تھے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد
اردو آرٹس کالج کے پرنسپل تھے یوگس ان کے خاص شاگردوں میں شمار کیے
جاتے ہیں۔ اردو آرٹس کالج کی ہر تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے

یوگس جب کلام سنانے کے لیے کھڑے ہو جاتے تو سامعین اُن سے آدھی غزل سنانے کی فرمائش کرتے۔ آدھی غزل اس طرح کہ ایک مصرع یوگس کا ہوتا اور دوسرا مصرعہ مرزا غالب کی غزل کا۔ شہر کے دیگر نامور اور با صلاحیت شاعروں کی طرح یوگس کا کلام سیاست اخبار میں چھپتا رہا۔ یوگس نے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے کئی بار اپنا کلام پیش کیا۔ یوگس حیدرآبادی کو عالمی اُردو کانفرنس کے بانی علی صدیقی صاحب نے اکثر بار دلی میں منعقدہ کل ہند مشاعروں میں مدعو کیا۔ میں خود بھی یوگس کے ساتھ علی صدیقی صاحب کی جانب سے منعقدہ کل ہند مشاعروں میں کلام سنا چکا ہوں۔ مشہور و معروف مزاحیہ رسالہ شگوفہ جس کو زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان بھی کہا جاتا ہے یوگس کا کلام خصوصیت کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا۔ یوگس کی بیسیوں غزلیں شگوفہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ یوگس حیدرآبادی اپنے پیشہ درس و تدریس میں بھی اپنی قابلیت، دیانت داری اور احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے مقبول رہے۔ شہر کے مختلف مدارس میں ان کی تعیناتی عمل میں لائی جاتی رہی۔ مدارس کے تمام ساتھیوں کے ساتھ اُن کے خوشگوار تعلقات رہے۔ یوگس حیدرآبادی جس زمانے میں ایم اے کے طالب علم تھے انہوں نے فکر تونسوی کے فن پر مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یوگس حیدرآبادی اگرچہ ملازم سرکار تھے لیکن انہوں نے اُردو تحریک میں کافی دلچسپی لی۔ بعض محبانِ اُردو کی طرح وہ بھوک ہڑتال میں بھی حصہ لیے۔ انہیں اُردو زبان و ادب سے بے حد دلچسپی تھی

ہمیشہ دوسروں کے کام آتے رہے۔ ہر مستحق شخص کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے ایک استاد کی حیثیت سے کئی طلباء کی بہترین تربیت کی۔ ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے حلقۂ درس و تدریس میں شہرت رکھتے تھے۔
بوگس حیدرآبادی مجلس کے آدمی تھے کسی محفل میں بھی بوگس کا موجود رہنا اس محفل کو لالہ زار بنانے کے لیے کافی تھا اکثر اضلاع کے مشاعروں میں ہم ایک ہی کار میں سفر کرتے رہے ہیں ان کے بہترین اچھوتے لطیفوں سے سفر نہایت خوشگوار رہتا۔ بوگس مشہور و مقبول شاعر تھے ان میں کبھی بھی پیشہ ورانہ شاعروں کا سا انداز نہیں پایا گیا۔ کبھی منتظمین مشاعرہ پر بار نہیں بنے۔ بلکہ میزبانِ محفل کی حیثیت سے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ بوگس حیدرآبادی اپنے احباب کی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ان کی طبیعت میں مزاح کے ساتھ ساتھ شوخی بھی تھی۔ سنجیدگی میں بھی اپنا آپ جواب نہیں رکھتے تھے لیکن دورانِ گفتگو اپنے مزاحیہ شاعر ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ محبوب حسین جگر، بوگس کو بہت پسند کرتے تھے ان کے منتخب اشعار شائع کرتے تھے بوگس حیدرآبادی کو ادبِ عالیہ سے بھی کافی دلبستگی تھی اساتذۂ سخن کا کلام انہیں یاد تھا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں ایک سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے تھے اور جگر صاحب کے کہنے پر مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال لکھتے تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے شاعروں میں حمایت اللہ صاحب سے گہرے مراسم تھے اگرچہ دوسرے شاعروں سے بھی رسم و راہ تھی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی اکثر مٹنگوں اور زندہ دلان کے آفس پر منعقدہ جلسوں میں شریک رہتے تھے جہاں ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی جب

کبھی وہ سیاست اخبار کو اپنے کسی کام کے سلسلے میں آتے تو مجھ سے ضرور مل لیتے تھے نہایت ایماندار، وضع دار اور شریف النفس انسان تھے مشہور شاعر ہونے کے باوجود ان میں غرور، گھمنڈ جیسی کوئی شئے موجود نہیں تھی انتہائی ملنسار تھے دوسروں کی مدد کے لیے پیش پیش رہتے تھے زندہ دلان حیدرآباد کے ارکان میں وہ بھی حمایت اللہ صاحب سے قریب تھے زندہ دلان حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ شگوفہ کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال سے بھی ان کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے بالخصوص مشاعرہ کے سلسلے میں چاق و چوبند رہتے۔ مہمان شعراء کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے انہیں وہ میزبانِ مشاعرہ کی حیثیت سے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے ہمارے شہر میں مزاحیہ شاعروں کی بھی ایک اچھی خاصی فہرست رہی لیکن بعض اہم مزاحیہ شاعروں کی طرح بوگس بھی میرے پسندیدہ شاعر رہے جب کبھی وہ مشاعروں میں شرکت کرتے تو ایک بریف کیس ان کے ساتھ رہتا بلکہ عام حالات میں بھی وہ بریف کیس اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ بوگس کے اپنے دوستانہ رویہ کی وجہ سے ہر مکتبِ خیال کے شعراء ان سے قریب تھے کل ہند صنعتی نمائش کے موقع پر نمائش کلب میں مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں شخصی دلچسپی لیتے تھے بوگس فائن آرٹس اکیڈیمی کے بھی رکن تھے شہر کی بعض ادبی و تہذیبی انجمنوں سے ان کی وابستگی تھی۔ شہر کے سنجیدہ شاعروں میں سعید شہیدی، خیرات ندیم، ناصر کرنولی، رئیس اختر اور راقم الحروف سے کچھ زیادہ ہی گہرے مراسم تھے جب تک حیدرآباد میں مزاحیہ مشاعروں کا سلسلہ جاری رہے گا بوگس حیدرآباد کی

بھی یاد رکھے جائیں گے۔ یوگس حیدرآبادی سے مجھے والہانہ دلبستگی تھی۔ بانی محفلِ خواتین وشاداں کالج ممتاز شاعرہ عظمت عبدالقیوم سے ان کی رشتہ داری تھی۔ عظمت عبدالقیوم کی گھریلو تقاریب میں بھی ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ بعض شاعر دوست کچھ اس طرح میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں کہ ان کی یاد سے میں غافل نہیں رہتا۔ یوگس حیدرآباد کا بھی میرے ان شاعر دوستوں میں سے ایک ہیں۔ جن کی شخصیت کی خوشبو ان کی شاعری کی طرح میرے تن من کو مہکا رہی ہے۔

اکمل حیدرآبادی

(خوش گو۔ خوش گلو اور خوش مزاج شاعر)

ذہن پر کافی بار ڈالنے پر بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ اکمل حیدرآبادی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی، لیکن اتنا یاد ہے کہ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں نئے شہر کے نوجوان شاعروں میں صرف اور صرف ایک ہی ایسا شاعر تھا جو مشاعروں اور تہذیبی پروگراموں کے انعقاد میں دلچسپی لیتا ہوا دکھائی دیتا تھا مجھے صرف دو ملاقاتیں یاد آرہی ہیں ایک تو خود اکمل کے گھر کی ملاقات جبکہ اُن دنوں شکیل بدایونی، حسرت جے پوری، خمار بارہ بنکوی، صبا افغانی وغیرہ حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور جن کا قیام اکمل کے گھر واقع ریڈ ہلز پر تھا شکیل بدایونی جب بھی حیدرآباد آتے اکمل ہی کے مکان میں ٹھہرتے تھے اکمل سے دوسری ملاقات ایک کل ہند مشاعرہ کے سلسلے میں ہوئی تھی جو ۲۴ برس پہلے (۱۹۶۰ء) نمائش کلب کے آفس کے سامنے کے میدان میں منعقد ہوا تھا اس مشاعرہ میں شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی،

صبا افغانی اور خضر چشتی پوری نے شرکت کی تھی۔ یہاں شاعروں میں شاہد صدیقی کے علاوہ مشہور و مقبول شعراء نے کلام سنایا تھا جو نئے شاعر کی حیثیت سے میں نے بھی اس مشاعرہ میں غزل پڑھی۔ دوبئی سے حیدرآباد آنے پر اکمل سے میری ملاقات دفتر سیاست میں ہوئی۔ میں نے جب شعرو ادب کی محفلوں میں شرکت کیلئے خواہش کی تو اکمل نے جواب دیا پیارے اول طعام بعدہٗ کلام۔ جواب معقول تھا میں کچھ دن خاموش رہا لیکن انہیں زیادہ دنوں تک ادبی محفلوں سے دور نہیں رکھ سکا۔ اکمل نے کہا تھا کہ ذرا اچھی طرح جم جانے دو مشاعروں میں شرکت کے لیے عمر پڑی ہے محفلوں میں آتا رہوں گا۔ زندگی سے لڑ رہا ہوں، حالات سے مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری ہے کچھ ہی دنوں بعد اپنے دوستوں کی محفلوں میں دوبارہ آتا رہوں گا۔ اکمل حیدرآبادی اور ان کے ہم خیال چند اہلِ قلم نوجوان دوستوں نے ۳۵ سال قبل ینگ پوئٹس اسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تھی میں بھی اس اسوسی ایشن سے وابستہ تھا اُس زمانے میں لکھنے والے نوجوان کا ایک بہت بڑا گروپ تھا لیکن نظریاتی اختلافات کی وجہ سے قلم کار دو گروپ میں بٹ گئے اور آج بھی وہ گروپ میں بٹے ہوئے ہیں لیکن ہر دو گروپ کے شاعر و ادیب اپنی اپنی سطح پر ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں اکمل کی یہ خوبی ہے کہ وہ دونوں گروپس سے اپنے تعلقات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اکمل کا ایک غیر معمولی کارنامہ اُن کی ایک ضخیم تحقیقی کتاب "فنِ قوالی" امیر خسرو سے شکیلہ بانو بھوپالی تک ہے یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے چھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس مخصوص موضوع پر ایک اہم کتاب ہے اس کتاب کی ترتیب و تزئین اور اس کے خد و خال کو سنوارنے میں اکمل نے کئی برس گذارے۔ (پیکرِ دو پرچھائیاں ۱۹۹۳)

مسیح انجم

(نامور مزاح نگار ـــــ شریف انسان)

اگر دنیا میں ایسے ویسے لوگ نہ ہوں تو شرفاء کی پہچان بہت مشکل ہو جائے گی معاشرہ میں اچھے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا شہر اور جنگل کے امتیاز سے بے نیاز ہو جائے گی جہاں کہیں اندھیرا ہوتا ہے وہاں اجالا بھی ہوتا ہے صبح کے ساتھ شام، نیکی کے ساتھ بدی، اچھوں کے ساتھ برے لوگوں کا وجود بھی ضروری ہے ورنہ یہ دنیا منجمد ہو کر رہ جائے گی اور کسی قسم کی ہلچل باقی نہیں رہے گی۔ معاشرہ کے وہ لوگ جو شرفاء کی صفوں میں شامل رہتے ہیں وہ اپنی اچھائیوں اور اپنی نیکیوں کی بدولت الگ پہچانے جاتے ہیں۔ لوگوں کی عادتیں اور ان کے اطوار بھی الگ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں ہر شخص اپنے انداز سے جینا چاہتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے کہ اپنے راستہ کا تعین کیا جائے۔ کسی راستے سے گزرتے ہوئے کس انداز سے اپنا سفر جاری رکھا جانا چاہئے یہ بات وہ لوگ ضرور جانتے ہیں جو معاشرہ میں

اپنی ایک منفرد شناخت کے ساتھ رواں دواں رہنا چاہتے ہیں۔ عقلِ سلیم یعنی پروردگارِ عالم کا ایک بہت ہی بڑا عطیہ ہے اگر عقلِ سلیم کو کام میں نہ لایا جائے تو انسان مختلف قسم کی مشکلات میں گھِر جاتا ہے اور سیدھے راستے پہ چلنا اس کے لیے آسان نہیں رہتا۔ مختلف شعبہ جات میں مختلف صلاحیتوں کی آئینہ دار شخصیتیں موجود رہتی ہیں۔ ہر شخص اپنے ذوق اپنے اپنے رجحان کے زیرِ اثر سانس لیتا رہتا ہے۔ لیکن زندگی کے سفر میں چاہے وہ مختصر ہو کہ طویل، حالات سازگار ہوں تو وہ اپنی نشوونما اور اپنی ارتقائی منازل کے لیے سست گام نہیں رہ سکتا۔ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اچھے مواقع میسر ہوں تو کوئی مسئلہ رکاوٹ کا باعث نہیں بنتا۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے بھی بہت سے لوگ اپنے مستقبل کو اس قدر روشن نہیں بنا سکتے جس قدر وہ چاہتے ہیں۔ قلم کاروں کی دنیا میں بھی نت نئے رنگ کے پھول کھلتے رہتے ہیں رنگ برنگے پھولوں سے چمنستانِ قرطاس و قلم تر و تازہ رہتا ہے ایسے پھول بھی جن کی شگفتگی ہر نئے موسم کے لیے آبروئے چمن بنی رہتی ہے کیا حوادث کا شکار ایسے پھول نہیں ہوتے جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتے ہیں۔ اگر مناسب انداز سے سرزمینِ گلستاں ہو تو ہر پھول کو آزادی کے ساتھ کھلنے کا موقع مل جاتا ہے شاعروں اور ادیبوں کی دنیا اس قسم کے حالات سے ہمیشہ دوچار رہتی ہے لاکھ صلاحیتوں کے باوجود اگر حالات ساتھ نہ دیں، ان کی صلاحیتوں کی بروقت حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو ان کی ترقی رک جاتی ہے اور دورانِ سفر بیچ راستے میں وہ اپنے وجود کو کھو بیٹھتے

ہیں۔ بعض قلمکار اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے بھی محدود ہوکر رہ جاتے ہیں۔ وہ اصلی فنکار جو کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں انھیں آلودہ فضا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کتنے ایسے قلم کار و فن کار رہیں گے جو اپنی صلاحیتوں کا پوری طرح اظہار نہ کر سکے۔ آندھیوں اور طوفانوں کی زد میں رہ کر بھی لوگ زندہ رہتے ہیں۔ تیز ہواؤں میں بھی بعض چراغ جلتے رہتے ہیں لیکن کب تک۔ جب حوصلہ شکنی کا سیلاب آ جاتا ہے تو راستے کے تمام پھول اور کانٹے بہہ جاتے ہیں۔

مجھے مسیح انجم جیسے اعلیٰ درجہ کے طنز و مزاح نگار کے پوری طرح نہ ابھرنے کا بے حد ملال ہے حالات نے ان کا خاطر خواہ ساتھ نہیں دیا۔ ان کے قلمکارانہ صلاحیتوں کو ان کے ماحول نے پا بہ زنجیر کر دیا۔ ادبی معاشرہ میں وہ اپنا ایک صحیح مقام بنا نہیں سکے جو بجا طور پر مستحق تھے۔ مسیح انجم بھیڑ بھاڑ کے آدمی نہیں تھے دورانِ سفر راستوں کے پیچ و خم سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان کی نظر منزل پر کم اور اپنے قدموں پر زیادہ رہتی تھی وہ ایک راہ روکی حیثیت سے اپنے قدموں کا بھی جائزہ لیتے تھے انہیں یہ خوف بھی رہتا تھا کہ ان کا سفر کہیں بیچ راستے میں رک نہ جائے۔ مسیح انجم کی تحریریں اگر اپنے ماحول کے توڑ جوڑ کا شکار نہ ہوتیں تو مزاحیہ ادب میں ان کا نام اور زیادہ روشن رہتا۔ اُن کی بے وقت موت نے بھی ان کی صلاحیتوں کو پوری طرح اجاگر ہونے نہیں دیا۔ بعض فن کار و قلم کار ابتدائی ادبی سفر میں ہی بہت زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں اور بعض اپنے ادبی سفر کی درمیانی مدت میں اور بعض اپنی

عمر کے آخری حصہ میں۔ مسیح انجم اپنے ابتدائی ادبی سفر کے دوران اپنے بہترین مزاحیہ تحریروں سے خاص طور پر حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کرتے چلے گئے۔ مسابقت کی دوڑ میں اپنی کسر نفسی کی وجہ سے پیچھے ہی رہے لیکن انہوں نے جو کچھ بھی ادبی سرمایہ اپنی کتابوں کی شکل میں چھوڑا ہے اُن سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور بعد از مرگ سہی مسیح انجم کے فکر و فن کی مزید قدر افزائی کی جاتی رہے گی۔ ہمارے شہر میں بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کے اظہار سے پہلے ہی آخرت کی راہ لی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک وہ بہ قیدِ حیات تھے اردو معاشرہ نے اُن کے ساتھ بہت کم اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ مسیح انجم اعلیٰ درجہ کے طنز و مزاح نگار تھے اُن کی تحریریں میری اس رائے کی بھرپور ترجمانی کریں گی بشرطیکہ پوری دیانت داری کے ساتھ اُن کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے۔ ہمارے شہر کے اردو کے نقادوں نے سچ پوچھیں تو ہمارے قلم کاروں پر بہت کم توجہ دی ہے بلکہ بعض قلم کاروں کے بارے میں انہوں نے کچھ بھی نہیں لکھا اور اگر لکھا بھی ہے تو بس رسمی طور پر بے دلی کے ساتھ جس طرح ملک کے دیگر قلم کاروں کی تخلیقات پر کھل کر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے، کھل کر تبصرہ کیا جاتا ہے اس طرح ہمارے شہر کے قلم کاروں کی تخلیقات پر کھل کر اظہارِ خیال نہیں کیا گیا ..... کچھ مستثنیات ضرور ہوتے ہیں لیکن جو قلم کار زیادہ توجہ کے مستحق ہیں اُن کی تخلیقات کو نقادوں نے بہ نظرِ طائرانہ بھی نہیں پڑھا۔ شاید پڑھنا بھی نہیں چاہتے ..... مسیح انجم کی طنزیہ و مزاحیہ ادب میں یقیناً اہمیت ہے ان کی تحریروں کو بڑے شوق

اسے پڑھا جاتا ہے۔ "شگوفہ" میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے
زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ کانفرنس میں ان کے مضامین بعض اجلاسوں
میں حاصلِ محفل رہے۔ مسیح انجم کے پڑھنے کا انداز بھی متاثر کن رہتا تھا۔
مدیر "شگوفہ" ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اپنے رفیقِ خاص کی حیثیت سے اُن کی تحریروں
کو مسلسل "شگوفہ" میں جگہ دیتے تھے۔ مسیح انجم نے سالانہ کانفرنسوں میں
مضامین پڑھنے کے علاوہ شہر میں منعقدہ مزاحیہ ادبی اجلاسوں میں بھی اپنے
مضامین سُنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ شہر کے مختلف کالجوں کی ادبی تقاریب
کے علاوہ شہر کی مختلف ادبی انجمنوں میں اپنی مزاحیہ تحریروں سے مستفید
ہونے کا موقعہ فراہم کرتے رہے۔ نہایت نفیس، خوش اخلاق، شریف انسان
تھے۔ اتنے کم گو بھی نہیں تھے کہ اُن پر مغرور ہونے کا الزام لگایا جائے۔ غیر
ضروری لب کشائی سے گریز کرتے تھے۔ گفتگو کے فن سے واقف تھے۔ اپنے
خاص دوستوں میں گھل مل کر رہتے تھے۔ ہنستے بھی تھے۔ قہقہہ بھی لگاتے تھے
منکسر المزاجی نے انہیں بہت زیادہ شریف آدمی بنا دیا تھا۔ شہرت کے پیچھے
انہوں نے کبھی بھی نہیں بھاگا۔ پسند بھی نہیں کیا۔ اُن کا معاملہ تو بس یہی تھا
"دیا بھی تو اُس کا بھلا اور نہ دیا بھی تو اُس کا بھلا"۔ نہایت وضع دار
مہذب شخص تھے زندگی کے آخری لمحوں تک وہ کسی کے دست نگر نہیں رہے۔
نہایت خود دار انسان تھے۔ مسیح انجم سے شگوفہ کے آفس پر بھی اکثر ملاقات
ہوتی تھی۔ مسیح انجم کا پیدائشی گاؤں دیکنور (سداسیوپیٹھ) ہے اصلی نام
محمد مسیح الدین ہے ١٦ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی ہوئی

میرا حوصلہ بڑھایا اور کہا "ضرور شائع کیجئے" میں نے ان کے ۲، ۳ مضامین خوشبو کا سفر میں شائع کیئے ہیں۔ انہیں میرے اداریہ بہت پسند آتے تھے خاص طور پر وہ اداریے جو طنزیہ ہوتے تھے۔ وہ بہت پسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ پرچہ ہی کیا جس میں اداریہ شامل نہ ہو۔ مسیح انجم نہ صرف میری گفتگو سے محظوظ ہوتے تھے بلکہ میری شاعری بھی انہیں پسند تھی۔ مسیح انجم سے اکثر ادبی جلسوں میں ملاقات ہوتی تھی زندہ دلان حیدرآباد کی میٹنگوں میں لازماً ملاقات رہتی۔ ایسے دوست ہرگز نہیں بھلائے جاسکتے جن کی نیکیاں اور خوبیاں فیضِ رواں کی طرح معاشرہ میں پھیلی ہوئی ہیں ـــــ زندہ دلانِ حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈیمی سے وابستہ تمام حضرات سے ان کے مراسم تھے۔ حمایت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وہاب قیصر سے بھی انہیں زیادہ قربت تھی۔ مسیح انجم میری کتابوں کی رسمِ اجراء تقاریب میں شرکت کرتے رہے۔ "ادارۂ میرا شہر میرے لوگ" کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے ان کی شرافت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کبھی بھی کسی شاعر یا ادیب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بلکہ فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر اہلِ قلم کی تعریف و توصیف میں صحیح مقام پر صحیح لفظوں کا استعمال کرتے تھے مسیح انجم کے بیسیوں مضامین آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوچکے ہیں دوردرشن نے بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا سیاست اخبار میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ زندگی لاکھ مصروف سہی میں اپنے مرحوم دوستوں کو بھی ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہوں انکی یادوں کے چراغ میرے دل میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جل رہے ہیں۔ خدا میرے ان تمام دوستوں پر مہربان رہے جو میری یادوں کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں ۔

گاؤں کی چادر گھاٹ کی چاوڑی کو مدرسہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں میٹرک سداسیو پیٹھ ہائی اسکول سے کامیاب کیا میٹرک کامیاب کرنے کے بعد عدالت سداسیو پیٹھ میں نقل نویسی پر مامور ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے خانگی امیدوار کی حیثیت سے بی اے۔ بی ایڈ کا امتحان کامیاب کیا۔ محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوئے بہترین استاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ادبی ذوق تھا۔ افسانہ نویسی سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۶ء میں روزنامہ ملاپ میں پہلا افسانہ شائع ہوا۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھنے لگے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے شریک معتمد اور معتمد رہے طنزیہ مزاحیہ مضامین کے علاوہ بہت سے خاکے لکھے رہنمائے دکن کے سنڈے ایڈیشن کے مرتب رہے۔ تلگو زبان میں مہارت ہونے کی وجہ سے عدالت منصفی میں مترجم کی خدمات بھی انجام دیں۔ دہلی۔ بمبئی۔ لکھنؤ۔ کلکتہ اور دیگر ریاستوں میں طنز و مزاح کے ادبی اجلاسوں میں شرکت کی۔ ان کی تین کتابیں سائیڈ سے چلیئے۔ "زیر پردہ" اور "چیانچہ" شائع ہو چکی ہیں اردو اکیڈیمی سے ان کی کتابوں کو انعام بھی مل چکا ہے۔ کچھ عرصہ روزنامہ منصف سے بھی وابستہ رہے ۲۲ مئی ۱۹۹۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ شیخ احمد سے میری پہلی ملاقات خیرات ندیم صاحب کے دولت خانہ پر ہوئی تھی۔ خیرات ندیم صاحب بھی پیشہ درس و تدریس سے وابستہ تھے بلکہ بعض مدارس میں دونوں کا ساتھ رہا۔ شاعروں میں میرا ایسا خیال ہے کہ خیرات ندیم صاحب کے بعد میں ہی اُن کے زیادہ قریب رہا ہوں۔ مجھ سے بہت بے تکلفی سے ملتے تھے ہم میں بے تکلفانہ گفتگو رہتی تھی جب میں نے خوشبو کا سفر نکالنا چاہا تو انہوں نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے

سید رحیم الدین توفیق

خاموش طبع، نفیس انسان۔ نامور سنجیدہ مزاح نگار

ہمیں اپنی سوسائٹی میں دو طرح کے لوگوں سے سابقہ رہتا ہے کچھ تو اپنے احباب، اپنے رشتہ داروں اور اپنے جاننے پہچاننے والوں سے کھل کر گفتگو کرتے ہیں اور کچھ صرف ضرورتاً گفتگو کرتے ہیں، خاموش خاموش سے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ طبائع مختلف رہتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کی خاموشی اظہار کا آئینہ ہوتی ہے لیکن ایسے لوگ جو کھلے دل و دماغ کے ہوتے ہیں چاہے وہ کھل کر گفتگو کریں یا خاموش رہیں، سوسائٹی کے لیے قابل قبول رہتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ زیادہ بولتے ہیں اُن کی [illegible] باتیں موضوع گفتگو کے لحاظ سے غیر موزوں رہتی ہیں یعنی اَن کہے مطلب لفظوں کے بغیر بھی گفتگو مکمل رہتی ہے اگر ایسا ہو تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شخص نہایت محتاط انداز میں گفتگو کیا کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جو لوگ گفتگو کے فن سے واقف رہتے ہیں وہ چنے تلے الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں [illegible] ان لفظوں کے استعمال سے مخاطب پر گفتگو کا اچھا اثر پڑتا ہے

اور ایک ایک جملہ اضافی لفظوں سے محفوظ رہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ شخص قادر الکلام اور قادر البیان ہے یعنی اس کی گفتگو کا ہر جملہ با معنی اور پُر اثر سمجھا جاتا ہے زیادہ لفظوں کا استعمال بعض دفعہ تفریحی صورتحال اختیار کر جاتا ہے لوگ سنتے ضرور ہیں لیکن سنجیدہ نہیں رہتے۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ زیادہ گفتگو کرنے والے پر روغن گوئی کا الزام لگ جاتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لفاظ شخص ہے یعنی اس کی گفتگو میں بہت سے لفظ قابلِ اعتبار نہیں رہتے، خارج سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح کے لفاظ لوگوں کے مقابلے میں خاموش طبع، کم کم گفتگو کرنے والے لوگ معاشرہ کے سنجیدہ لوگوں میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں مشاہدہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی شناخت بڑی آسانی سے کی جا سکتی ہے ہر شخص کے یقیناً احباب ہی زیادہ ہوتے ہیں اور ان احباب میں دونوں قسم کے یعنی دونوں طبائع کے لوگ موجود رہتے ہیں اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ "کبوتر ہم جنس با ہم جنس پرواز"۔

زیادہ گفتگو کرنے والوں کا ایک حلقہ رہتا ہے اور کم گفتگو کرنے والوں کا ایک حلقہ۔ لیکن ان دونوں حلقوں کے امتزاج سے بعض دفعہ ایک عجیب صورتحال پیدا ہو جاتی ہے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کون کس حلقہ سے تعلق رکھتا ہے بہر حال ہر شخص یکسانیت کے بعد تنوع کا متمنی رہتا ہے اس کی ایک روشن مثال نامور طنز و مزاح نگار اور معاشرہ کے ایک نفیس انسان رحیم الدین توفیق کی بھی تھی رحیم الدین توفیق کو میں گفتگو کے دوسرے زمرہ میں شامل کرتا ہوں اس لیے کہ انہیں میں نے جب بھی دیکھا، جب

بھی اُن سے گفتگو کی انہیں بے حد سنجیدہ پایا حالانکہ اُن سے بیسیوں دفعہ ملاقاتیں رہیں، لیکن رسمی۔ رحیم الدین توفیق میری استاد، صاحب طرز طنز و مزاح نگار پروفیسر حبیب ضیاء کے شوہرِ محترم تھے وہ ہمیشہ پروفیسر حبیب ضیاء کے ساتھ ادبی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ رحیم الدین توفیق صاحب کے ساتھ پروفیسر حبیب ضیاء آتی تھیں۔ کون کس کے ساتھ آتا ہے یہ بات اہم نہیں ہے یہ بات اہم ہے کہ دونوں کو ادبی ذوق کھینچ لاتا تھا۔ دونوں ہم خیال تھے۔ ایک دوسرے سے والہانہ محبت تھی دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی تھی، محفلوں میں دونوں خاموش رہتے۔ کبھی کسی سے بھی غیر ضروری گفتگو نہیں کرتے تھے۔ میں رحیم الدین توفیق کا دوست کبھی نہیں رہا البتہ ایک ادیب اور میری استاد کے شوہرِ محترم ہونے کی وجہ سے ان کی عزت کرتا تھا اُن سے زندہ دلان حیدرآباد کی میٹنگوں میں ملاقات ہوا کرتی تھی پھر بعد میں ادبی جلسوں اور مشاعروں میں اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ (میں بھی زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ تھا) میری ابتدائی ملاقات کا آغاز زندہ دلان حیدرآباد کی میٹنگوں سے ہوا۔ رحیم الدین توفیق کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شگوفہ میں شائع ہوتے رہے تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مزاحیہ و طنزیہ مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن میں نے کسی بھی محفل میں انہیں مضمون پڑھتے ہوئے یا انہیں تقریر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے منتخب مضامین کی کتاب "کہیں دیکھا ہے" میرے

حوا لے دی جو میرے کتب خانے کی زینت بنی ہوئی ہے رحیم الدین توفیق مرنجاں مرنج نہایت شریف پروقار، با اخلاق بردبار اور نیک صفت انسان تھے پُر خلوص، شائستہ و سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے نہایت پُر تپاک طریقے سے ملاقات کرتے تھے۔ میں نے رحیم الدین توفیق صاحب کو اور پروفیسر حبیب ضیاء کو ہمیشہ وقت مقررہ پر ادبی جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے قابلِ مثال جوڑی تھی ان دونوں کی قابلِ رشک ازدواجی زندگی رہی نہایت خوشحال و آسودگی کے ساتھ ان کے شام و سحر گزرتے رہے۔ رحیم الدین توفیق کے انتقال کے بعد کئی دنوں تک پروفیسر حبیب ضیاء اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکیں۔ شدید صدمہ سے دوچار رہیں۔ اب کچھ نارمل ہوئی ہیں لیکن اپنی ادھوری زندگی کے ساتھ ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتی ہیں۔ ادبی محفلوں میں کم کم شرکت کر رہی ہیں رحیم الدین توفیق میرے زیر اہتمام منعقد ہونے والے میرا شہر میرے لوگ کے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں باپابندی شرکت کرتے تھے اور اختتام تقریب تک شریکِ محفل رہتے تھے۔ دورانِ محفل کبھی بھی اُٹھ کر نہیں جاتے تھے۔ ادبی جلسوں میں بھی شریک رہتے تھے اور مشاعروں میں بھی۔ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے اُجالوں کے مسافروں کے زیر عنوان ڈاکٹر حبیب ضیاء کے فن اور شخصیت کے اعتراف میں ادبی تقریب منعقد کی گئی تھی ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ اس تہنیتی جلسے کو شہر کے مشاہیرِ اردو ڈاکٹر سید عبدالمنان، پروفیسر جعفر نظام، ڈاکٹر صادق نقوی

نہیال سنگھ ورما، ہاشم حسن سعید، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے مخاطب کیا تھا۔ پروفیسر حبیب ضیاء اپنے شاگرد (یعنی راقم الحروف) کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتی ہیں انہوں نے میری کتابوں کی رسم اجرائی تقاریب کے موقعہ پر ہمیشہ پُر خلوص گلدستہ پیش کیا۔ شاد اُرتھاکر بھی خوشی محسوس کرتی رہیں توفیق صاحب سے کچھ ملاقاتیں شگوفہ کے دفتر پر بھی ہوئی ہیں ـــ ایک دن یہ انتہائی تکلیف دہ خبر ملی کہ رحیم الدین توفیق صاحب کا انتقال ہو گیا ہے بے حد صدمہ ہوا۔ میت کے دیدار کے لیے گھر پہونچا۔ تمام لوگ آب دیدہ تھے رنج و غم میں ڈوبے ہوئے تھے وہاں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال سے ملاقات ہوئی جن سے توفیق صاحب کے عارضہ اور انتقال کی تفصیل معلوم ہوئی۔ البتہ انتقال سے ۳، ۴ دن پہلے میں نے سُنا تھا کہ بہ وجہ ناسازی مزاج انہیں کسی ہاسپٹل میں شریک کیا گیا تھا۔ سید رحیم الدین توفیق ۴ر اکٹوبر ۱۹۳۲ء حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید یوسف الدین تھا۔ توفیق صاحب نے چنچل گوڑہ ہائی اسکول دارالعلوم، سٹی کالج اور دلوک ورکشاپ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد انہیں ترک تعلیم کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ بی اے اور ایم اے کی تکمیل جد اتکل یونیورسٹی بھوبنیشور سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا۔

اار اکٹوبر ۱۹۶۳ء ان کی شادی ڈاکٹر حبیب ضیاء سے ہوئی۔ حبیب ضیاء صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی کالج فار ویمن کے عہدے سے ۱۹۹۵ء میں سبکدوش ہوئیں۔ رحیم الدین توفیق کو ایک لڑکی عفت النساء اور ایک لڑکا سید فہیم الدین ہیں لڑکی کی شادی سید افتخار الدین (آرٹ ڈائرکٹر جدہ) سے ۱۹۸۴ء میں ہوئی

سید فہیم الدین نے MBA کر کے دوبئی میں ملازمت اختیار کی۔ وہاں وہ بحیثیت مارکیٹنگ انجینئر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں دونوں بچے اطاعت گزار اور فرض شناس ہیں۔ والدین کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں۔ رحیم الدین توفیق کو ابتدا ہی سے ادب سے لگاؤ تھا زمانہ طالب علمی ہی سے وہ مختلف ناول نگاروں کی تخلیقات کو دلچپی سے پڑھتے تھے طنز و مزاح سے فطری لگاؤ تھا۔ شفیق الرحمٰن کے علاوہ دوسرے مزاح نگاروں کے مضامین کو نہ صرف پڑھتے بلکہ بے انتہا سراہتے تھے طنز و مزاح لکھنے کی فطری صلاحیت تھی ایک عرصہ تک مضامین لکھ کر فائیل میں رکھ دیتے۔ بعد میں ماہنامہ شگوفہ اور اخبار منصف اور عوام میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۹۹ء میں مضامین کا مجموعہ "کہیں دیکھا ہے" شائع ہوا۔ ادبی حلقوں میں اس کی خاص پذیرائی ہوئی دانشوروں نے بے حد پسند کیا۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے اُردو اکیڈیمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد نے مالی تعاون کیا۔ کتاب پر اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا یادگار ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔ حیدرآباد کی مختلف ادبی انجمنوں سے وابستہ تھے زندہ دلانِ حیدرآباد، انجمن ترقی اُردو، انجمن ترقی پسند مصنفین ادارۂ میرا شہر میرے لوگ، ادارۂ ادبیات اُردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ادبی تقاریب میں پابندی سے شرکت کرتے تھے گذشتہ دس بارہ برسوں سے ماہنامہ شگوفہ کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے ان کی فرض شناسی اور ادبی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے انہیں یہ اعزاز دیا جسے آخر دم تک انھوں نے بحسن خوبی نبھایا۔ وہ آئی ڈی پی ایل گیسٹ ہاؤز مینجر کی

حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۹۰ء کو وظیفہ حسنِ خدمت
پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا خاص وصف محنت، لگن اور دیانت داری
رہا۔ دورانِ ملازمت انتہائی شاندار ریکارڈ رہا۔ آئی ڈی پی ایل کالونی
کے مکینوں اور کمپنی کے عہدیداروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے
حساس طبیعت کے مالک تھے خاموشی ان کی فطرت تھی بیوی بچوں سے بے حد محبت
کرتے تھے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ توجہ دیتے رہے۔ خاندان کے سبھی افراد
ان کی خوش مزاجی، نیک اور سلجھی ہوئی فطرت سے متاثر تھے ہمیشہ خود کو مصروف
رکھا کرتے تھے لکھنے پڑھنے کے علاوہ بچپن ہی سے موسیقی سے فطری لگاؤ تھا
مشہور شعراء کی غزلیں ازبر تھیں حیدرآباد کے مشہور گلوکار جناب وٹھل راؤ سے
استفادہ کیا۔ سنگیت سادھنا کے زیر اہتمام منعقد کی جانے والی موسیقی کی محفلوں
میں شریک ہوتے تھے۔ رحیم الدین توفیق نے با اصول زندگی گزاری کبھی کسی کی
دل آزاری نہیں کی اور نہ کسی کو نقصان پہنچایا۔ چند ماہ کی مختصر علالت
کے بعد ۴ مارچ ۲۰۰۲ء کو اُن کا انتقال ہوا ــــ رحیم الدین توفیق کے
انتقال سے ہم ایک بہترین ادیب، اعلیٰ درجہ کے انسان سے محروم ہو گئے۔
مرحوم نہایت وجیہہ بھرپور شخصیت کے حامل انسان تھے۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

عزیز بھارتی

(سلسلۂ روز و شب کے ایک کامیاب شاعر محفل کے آدمی)

ایسے اہلِ قلم جو اپنی زندگی کے خد و خال کی ترتیب و تزئین میں مخلصانہ اور دیانت دارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں انہیں اپنی شخصیت اور اپنی فنکارانہ حیثیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں کبھی بھی مایوسی نہیں ہوتی۔ معاشرہ میں سانس لینے والے ایسے دانشوروں کا ایک ایک لمحہ حیاتِ جاوداں کی بشارت دیتا ہے اور وہ بلا قیدِ موسم اپنے فکر و خیال کو پیراہنِ گل سے آراستہ کرتے ہوئے مشامِ دل و جاں کو معطر کرتے ہیں اپنی شناخت اپنی پہچان انسان کا سب سے اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے اپنے وجود کا احساس انسان کو باوقار انداز میں جینے کا فن سکھاتا ہے اپنی شاعرانہ انا اور اپنی خودداری کا تحفظ اصول پسندی، حق شناس اور باکردار اہلِ قلم کا وتیرہ ہوتا ہے عزیز بھارتی بھی اسی زمرہ سے تعلق رکھنے والے شاعر ہیں جنھیں قدرت نے ان تمام خوبیوں سے سرفراز کیا۔ عزیز بھارتی نے ایک شاعر اور معاشرہ میں پسند کیے جانے والے ایک انسان کی طرح اپنی زندگی کے سفر کو خوشگوار انداز میں

جاری رکھا۔ انکی طبیعت ہمہ رنگ اور تنوع پسند ہے لیکن اس کے باوجود ان کے رکھ رکھاؤ، انکی نشست و برخواست کی میانہ روی، ان کی شخصیت کی آبیاری میں معاون ثابت ہورہا ہے عزیز بہارتی ایک معتبر شاعر کی طرح اپنی مخصوص انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے فن کے ساتھ دیانت داری برت رہے ہیں ان کا شاعرانہ لب و لہجہ بھی ان کے شائستہ اندازِ گفتگو کی طرح متاثر کرتا ہے انکی شاعری بھی مشاہدات، تجربات و محسوسات کا ایک ایسا دل پذیر تحفہ ہے جس کی خوشبو دامانِ شعر و ادب کو مہکا رہا ہے۔ عزیز بہارتی زائد از ۵ ۲ سال سے شعر و ادب کی محفلوں میں اپنے شاعرانہ وجود کا بھرپور احساس دلا رہے ہیں۔ دل میں نشتر کی طرح اُتر جانے والے اُن کے شعر قاری و سامع کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔ عزیز بہارتی نے جہاں اچھی غزلیں کہی ہیں وہیں انہوں نے عمدہ نظمیں و قطعات بھی کہے ہیں انہوں نے ہر صنفِ سخن کے ساتھ انصاف کیا ہے جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے وہ ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کے قطعات بھی متاثر کرتے ہیں۔ عزیز بہارتی کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن وہ اپنے مخصوص احباب میں ہی زیادہ کھلتے ہیں شاعرانہ بانکپن، دلنشین اندازِ گفتگو اور متاثر کن لب و لہجے کی وجہ سے وہ اپنے احباب میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں عزیز بہارتی ایک طویل عرصہ سے درس و تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ ہیں اور اپنی تدریسی ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں اپنے شاعر دوستوں کی طرح اپنے ہم پیشہ اساتذہ سے بھی اُن کے روابط استوار ہیں میری دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی موجودہ شناخت کے تحفظ اپنا شعری سفر جاری رکھیں

(اقتباس سپردہ پرچھائیاں ۱۹۹۳ء)

جوہر ہاشمی

(کہنہ مشق شاعر، باکردار اور مخلص انسان)

پُرانے شہر کے ہیرے ہم مزاج شاعروں میں کچھ ایسے شاعر بھی تھے جنہیں ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ جن کی بے لوث دوستی، جن کی بے ریا و بے داغ زندگی ہر اُس شخص کے لیے شمع فروزاں رہی جو اُجالوں اور اندھیروں کے فرق کو محسوس کرتے رہے جن کی پاک و صاف، پُرکشش شخصیت اُس راہی کے بھی قدم روک لیتی ہے جو راستوں میں موجود رکاوٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے گذرنا چاہتے تھے اور "کہاں گئے وہ لوگ" کہنے والے لوگ بھی اوراقِ ماضی کا حصہ بنتے گئے۔ اگرچہ ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے لوگ ہمیشہ کے لیے دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں لیکن اُن کی اچھائیاں، اُن کی خوبیاں دامن گیر رہتی ہیں اور اپنی یادوں سے یہ احساس دلانا چاہتی ہیں کہ اگرچہ ہم جسمانی طور پر تمہارے ساتھ نہیں ہیں لیکن ہماری یادیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی جو تمھیں ہماری کمی کا احساس دلاتی رہیں گی۔ عمر کی آخری منزل پر پہونچنے والا

انسان جب ماضی کے اوراق اُلٹنے لگ جاتا ہے تو ایک ایک لمحہ متوجہ کرتا ہے کہ ہم اپنی مصروف زندگی کے کچھ لمحات اپنے دوستوں، اپنے چاہنے والوں کے لیے بھی نکالیں۔ رواں دواں زندگی اگرچہ کہیں بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی لیکن کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں رک کر دم لینا پڑتا ہے یادوں کا قافلہ منزل تک پہونچنے کے بعد پھر سرگرم عمل رہتا ہے۔ یادیں انسانی زندگی میں بہت بڑی نعمت ہوتی ہیں اگر انسان سے اُس کی یادیں چھین لی جائیں تو اُس کی زندگی ادھوری رہے گی اس لیے روشن ضمیر، پاک طینت اور روشن دل و دماغ رکھنے والے لوگ یادوں کو اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ بنا لیتے ہیں جو ان کی ہر سانس سے وابستہ رہتا ہے ـــــ میرے بہت سے شاعر و ادیب دوست جو اوراقِ ماضی سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں کچھ ایسے بھی تھے جو میرے دل میں پیوست ہو کر رہ گئے ہیں اُن میں سے ایک مکمل ترین شخصیت نامور شاعر جوہر ہاشمی کی بھی تھی جوہر ہاشمی کی ساری عمر کشمکش حیات سے برسرِ پیکار رہی۔ پل بھر کے سکون کے لیے اُس شخص نے کئی برس گزارے، اپنی زندگی کی بہتری اور اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے سخت جد و جہد کی۔ بیماری ہو کہ صحت مندی کا زمانہ ہو، وہ اپنے کاروبار سے جڑے ہوئے رہے اُن کی تمام زندگی دھوپ چھاؤں، راحتوں اور تلخیوں سے عبارت ہے۔ جوہر ہاشمی ۱۹۳۰ء میں کنٹر لور ضلع ناندیڑ میں پیدا ہوئے منشی فاضل جامعہ نظامیہ کے طالب علم رہے عینک سازی / تجارت سے کاروبار سے وابستہ ہوئے۔

جوہر ہاشمی پرانے شہر کے نامور استاد شاعر تھے عینکوں اور فونٹین پن کے کاروبار سے ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ اُن کے فرزندان اب بھی اپنے شفیق باپ کے کاروبار کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں جوہر ہاشمی کی دوکان پتھر گٹی پر جو ہری کی دوکان کے سامنے ایک چھوٹے سے کھلے حصے پر واقع ہے دروازہ اور قفل سے بے نیاز ہے یعنی ان کی دوکان ایک کھلی دوکان ہے جو رات کو ڈبیوں میں بند رہتی ہے اور دن میں کھل جاتی ہے ان کی دوکان فٹ پاتھ کی دوکانوں کا ایک حصہ ہے بلڈنگ کے نیچے۔ یہ وہ کھلی دوکان ہے جہاں اُردو کے نامور شاعر علامہ نجم آفندی اور علامہ حیرت بدایونی بھی دم بھر کے لیے رک جاتے تھے۔ اپنی مرضی کے پن بھی خریدتے تھے یہ بات مجھے خود جوہر ہاشمی نے بتائی تھی۔ ویسے پرانے شہر کے تقریباً تمام شاعر ان کی خدمات سے مستفید ہوتے رہے ہیں جوہر ہاشمی انتہائی با اخلاق با مروت دوستی کے قابل انسان تھے جب کبھی میں پتھر گٹی سے گزرتا لازماً کچھ دیر کے لیے اُن کی دوکان پر رک جاتا۔ جیسے ہی میں پہونچتا مجھ سے کہتے چلیے آدھی پیالی چائے ہو جائے۔ پھر وہ شہران ہوٹل لے جاتے۔ بعض دفعہ دوکان پر ہی چائے منگواتے تھے موسم گرما میں شہران کی لسی سے تواضع کرتے اور کبھی زیادہ خوش رہتے تو کہتے چلیے گلزار حوض تک چلیں۔ بازو ہی آگرہ ہوٹل ہے جہاں کی مٹھائی بہت اچھی ہوتی ہے جوہر ہاشمی بہت کھلے دل کے انسان تھے دوستوں کی تواضع کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔

جوہر صاحب سے میری دوستی کی عمر تقریباً ۴۲ برس رہی پرانے شہر کے اکثر

مشاعروں میں اُن سے ملاقات ہوتی تھی تیتے شہر کے بعض بڑے مشاعروں میں بھی انہوں نے کلام سنایا ہے کُل ہند مجلس اتحادالمسلمین کے زیراہتمام ہونے والے سالانہ کُل ہند مشاعروں میں ہر سال مدعو رہتے۔ جوہر ہاشمی ترنم میں شعر سناتے تھے ان کا ترنم بہت خاص تھا اپنے مخصوص ترنم سے مشاعرے کو پُراثر بنا دیتے تھے آدابِ محفل کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے سینیئر شاعروں اور اساتذۂ کرام کا احترام کرتے تھے جوہر ہاشمی صرف مشاعرے کے شاعر ہی نہیں تھے کتابوں اور رسائل کے بھی شاعر تھے ملک بھر کے ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے اخبار سیاست میں پابندی کے ساتھ کلام شائع ہوتا تھا۔ خوشبو کا سفر میں بھی ان کی غزلیں شائع ہوتی رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کا کلام نشر ہوتا تھا دوردرشن کے انجمن کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا چکے ہیں ان کے دو شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں نگارِ سحر ۱۹۷۹ء اور نشاطِ سحر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئیں۔ ان کی کتابوں پر ملک کی بعض اردو اکیڈیمیوں سے انعام مل چکا ہے حیدرآباد میں کئی سرکاری مشاعرے پڑھ چکے ہیں کُل ہند مشاعروں میں بھی حصہ لیا۔ اضلاع کے مشاعروں میں اکثر ہمارے ساتھ رہتے بلکہ ہمارے ہم سفر رہتے۔ ہماری کار میں وہ بھی رہتے۔ جوہر ہاشمی استاد شاعر طالب رزاقی کے خاص شاگرد تھے جوہر ہاشمی کے بھی شہر اور اضلاع میں بہت سے شاگرد ہیں آدابِ مشاعرہ اور مشاعروں کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے شیروانی زیبِ تن کرتے تھے میرے ہم خیال شاعر دوستوں میں ان کی رسم و راہ خاص طور پر بوشیار اختر

اور ڈاکٹر راہی کچھ زیادہ ہی تھی۔ پیر اسنے شہر کے ایک مشہور شاعر لیے ہوش محبوب نگری سے بھی ان کے گھر سے مراسم تھے لیے ہوش صاحب کو میں نے ان کی دوکان پیر اکثر دفعہ دیکھا ہے جو ہر ہاشمی کے ۵ بیٹے ہیں جن کے نام یہ ہیں سید منور علی، سید اعجاز علی، سید اسحاق علی، سید ابراہیم علی، سید یوسف علی۔ ان کے چھوٹے فرزند سید یوسف علی نے ان کے کاروبار کو سنبھال لیا ہے۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں شاید ہی پیرانے شہر کا کوئی مشاعرہ ہوگا جس میں جوہر ہاشمی نے شرکت نہ کی ہو انتقال سے کچھ برس پہلے وہ تنفس کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جوہر ہاشمی کی منتظمین مشاعرہ پیر یار نہیں ہے۔ ان کی موجودگی سے کار کا سفر نہایت خوشگوار ہوتا تھا۔ بہت ہی پیارے انسان تھے وضع داری، انکساری، شرافت ان کی طبیعت کا ایک خاص وصف تھا۔ انہوں نے رشتۂ دوستی کو زندگی کے آخری لمحوں تک سلیقے کے ساتھ نبھایا۔ کسی بھی شاعر سے ان کی چشمک نہیں تھی۔ ہر مکتبِ خیال کے شاعروں نے انہیں پسند کیا۔ شہر کے مقبول شاعر تھے نعتیہ مشاعروں میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ شرکت کرتے تھے عطر کی ایک شیشی ان کے جیب میں موجود رہتی۔ سر پیر ٹوپی رہتی۔ ٹوپی صرف نعتیہ و منقبتی مشاعرہ میں پہنتے تھے۔ غزل کے مشاعروں میں اپنے پورے بانکپن کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ میرا شہر میرے لوگ، سوغاتِ نظر کے مشاعروں میں شریک رہا کرتے تھے صرف اردو کے شاعروں ہی سے نہیں ہندی کے شاعروں سے بھی ان کی دوستی تھی۔ ہتاری نیکھاک سنگھ اور گیت چاندنی کے مشاعروں میں شریک رہتے۔ ہندی شاعروں میں نہال سنگھ ورما

ان کے پسندیدہ شاعر رہے۔ جوہر ہاشمی شگفتہ مزاج تھے کبھی بھی ان کے چہرہ پر کسی بھی قسم کے تردد کی علامت دکھائی نہیں دی۔ ہر حال میں خوش رہنے کے عادی تھے جس حالت میں وہ جی رہے تھے خدا کا شکر ادا کرتے تھے اللہ پر بھروسہ کرنے والے توکل پسند انسانوں کی خدا مدد کرتا ہے نیک انسان تھے اس لیے بھی اپنے کچھ خاص دوستوں کی نظر میں رہے۔ وہ خود ایک پاک و صاف انسان تھے اس لیے ان کے دوستوں کا حلقہ بھی پاک و صاف لوگوں کا تھا۔ اُن کا مجھ سے غیر معمولی یارانہ تھا بے حد خلوص سے ملتے تھے انہوں نے اپنی شاعرانہ وضع دارکا کو کبھی متاثر ہوتے نہیں دیا۔ ایسے ہی مشاعروں میں شرکت کرتے تھے جہاں انھیں شرکت کرتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی تھی مشاعروں میں وقت پر پہونچ جاتے تھے مشاعرہ کے اختتام تک شریکِ محفل رہتے تھے آدابِ مشاعرہ سے کما حقہ واقفیت کی وجہ سے شاعروں کو داد دینے کا ان کا طریقہ بھی باوقار ہوتا۔ بہترین شاعر تھے علمِ عروض سے بھی واقفیت تھی جو مشاعرے میرے زیرِ اہتمام رہتے اُن مشاعروں میں جوہر ہاشمی کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے شخصی دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ جوہر ہاشمی جیسے وضع دار، شریف انسان اور معتبر شاعر جہاں کہیں بھی ملتے ہیں تو ٹوٹ کر ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اچھا انسان ہمیشہ ساتھ رہتا ہے فکر و خیال کے گوشوں میں محفوظ رہتا ہے اللہ مغفرت کرے بے حد نیک انسان تھے جوہر ہاشمی کا بسوا کلیان کے نعتیہ مشاعرہ میں گذشتہ ۱۲، ۱۵ برسوں سے ہمارا ساتھ رہا۔ اُن کے ہم سفر رہنے سے سفر بے حد خوشگوار رہتا تھا۔ دلچسپ لطائف کا سلسلہ جاری رہتا۔ بھرپور تفریح ہو جاتی تھی۔ ادارہ سوغاتِ نظر کی جانب

سے ان کے فکر و فن کا جائزہ اجلاس منعقد کیا جا چکا ہے۔ ایوانِ پریس منعظم جاہ شیجیع کے شاعروں کے علاوہ اُردو مجلس کے شاعروں اور ایوانِ اُردو کے سالانہ مشاعروں میں بھی کلام سُنا چکے ہیں۔

جب تک میں رہوں گا میری ہر سانس انہیں خراج پیش کرتی رہے گی۔ اچھا انسان، اچھا دوست اپنی بہترین نیکیوں اور اپنے بے لو جذبۂ خلوص سے ہر شخص کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ جوہر ہاشمی ایسے شاعر ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔

سید نور محمد

(حلیم الطبع۔ رقیق القلب۔ خوش مزاج شخصیت)

اگر کسی شخص کی زندگی میں خاندانی اور ذاتی شرافت ہم رکاب ہو جاتی ہے تو اس کا ہر ایک کام جو خود اس کی اپنی ذات اور معاشرہ سے وابستہ رہتا ہے بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اجالے اس وقت زیادہ روشن رہتے ہیں جب ان کا گذر اندھیروں کے درمیان نہ سہی اس کے آس پاس سے ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے زندگی میں اجالوں اور اندھیروں کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے صراطِ مستقیم کے ساتھ ساتھ ٹیڑھے میڑھے راستے بھی ایک راہرو کے قدموں کی آہٹ سے مانوس رہتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا شخص ہی اپنی زندگی میں کامیابی کی منزل طے کرتا چلا جاتا ہے جو ہر قسم کے حالات سے آشنا ہو اور اس میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ ٹھنڈی چھاؤں سے راحت محسوس کرتے ہوئے دھوپ کی تمازت بھی برداشت کرے۔ اس طرح کے حالات سے گزرنے کے لیے ایک لمبی عمر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی قسمت میں جتنے ماہ و سال

ہوں گے وہ اتنا سفر طے کرتے رہیں گے۔ اگر کوئی شخص ہر قسم کے حالات کا سامنا
کرنے کے موقف میں رہے تو وہ اپنی زندگی کامیابی و کامرانی کے ساتھ گزار
سکتا ہے۔ خاندانی شرافت ہی نہیں ذاتی شرافت بھی انسان کی زندگی کا انمول
خزانہ ہوتی ہے اس خزانے کی حفاظت ضروری ہے اور ایسے لوگ ہی اس کی
حفاظت کرتے ہیں جن کا ہر کام اللہ کی مرضی کے تابع رہتا ہے اگر کوئی شخص
اُجالوں اور اندھیروں کے درمیان اپنی زندگی کی شروعات کرتا ہے تو وہ ان
حالاتِ زندگی کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتا ہے۔ بہت کچھ کرنے کے
لیے عمر کا ساتھ دینا بھی ضروری ہے مختصر زندگی میں اُس کے بہت سے کام
ادھورے رہ جاتے ہیں اور سوچتے سوچتے عمر کا سورج ڈوب جاتا ہے
اس طرح کی کیفیات سے گزرنے والی ایک جوان مرگ شخصیت اپنی
خوبیوں، اپنی نیکیوں اور اپنی شرافت کی وجہ سے یادوں کا ایک حصہ
بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت سید محمد نور کی ہے۔ سید نور محمد
اعجاز پریس چھتہ بازار کے مالک تھے ان کے والد محترم میرے استاد پروفیسر
سید محمد تھے جو فرزندانِ جامعہ عثمانیہ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ پروفیسر
سید محمد ظہیر حسین خدمت کے بعد اعجاز پریس میں اپنا زیادہ وقت دیا کرتے
تھے انہوں نے اپنے زیرِ نگرانی اپنے بیٹے سید نور محمد کو پریس کے کام پر لگا دیا تھا
نور محمد نے جامعہ عثمانیہ سے بی کام کی ڈگری حاصل کی۔ پریس میں چھپوائی
کے درمیان نور محمد کا ایک ہاتھ اتفاق سے مشین میں چلا گیا تھا جس کی
وجہ سے ان کا ہاتھ کٹ گیا۔ پروفیسر سید محمد صاحب کے انتقال کے بعد

سید نور محمد نے اپنے چھوٹے بھائی سید ممتاز محمد کے تعاون سے پریس کے کام کو جاری رکھا۔ ممتاز محمد طباعت اور طباعت سے متعلق سارے کام دیکھ لیا کرتے تھے نور محمد کام کی نگرانی کرتے تھے کچھ برس کے بعد ممتاز محمد نے اعجاز پریس سے متصل اپنا الگ پریس لگالیا۔ نور محمد نہایت با اخلاق با مروت، دیانت داری و وفاداری کے ساتھ اپنے کاروبار کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ چھتہ بازار میں پرنٹنگ پریس کے اور بھی مالکین موجود ہیں یقیناً وہ لوگ قابل [illegible] بھی ہوں گے لیکن میرا رابطہ تقریباً ۵۰ برس سے اعجاز پرنٹنگ پریس سے قائم ہے میری تقریباً تمام شعری و نثری کتابیں اعجاز پریس ہی میں شائع ہوئیں۔ سید نور محمد سے میرے روابط تقریباً ۲۵ برس سے ہیں۔ نور محمد کے شب و روز اعجاز پریس کی ترقی اور بہتری کے سلسلے میں گزرتے رہے۔ نور محمد کی بے وقت موت نے ان کے بہت سے کاموں کو ادھورا چھوڑ دیا۔ ۵ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ان کا انتقال دماغ کی شریانیں پھٹ جانے کی وجہ سے ہوا انتقال کے وقت ان کی عمر ۴۴ برس کی تھی۔ نور محمد نے جتنی عمر پائی اس عمر میں نیک نامی کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا۔ ان کے ایماندارانہ اور پاک و صاف کاروباری انداز نے انہیں مقبول بنا دیا تھا۔ پریس کو آنے والا ہر شخص پورے بھروسہ کے ساتھ اپنا کام حوالے کرتا تھا نور محمد پریس کو آنے والے تمام لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے یہی نہیں پریس کا ہر کام نہایت کم اجرت پر تکمیل کرواتے۔ ستھرے ستھرے کاروبار ہونے کی وجہ سے ایک

اجنبی شخص بھی بالراست اُن کے پریس پہونچ جاتا تھا اور اس کا کام کم اور واجبی اجرت پر تکمیل پا جاتا۔ نور محمد بے شمار خوبیوں کے مالک تھے کاروباری دنیا میں نہایت ایماندار شخص مانے جاتے تھے ان کے پریس میں ہر عقیدے کے اشخاص اپنا کام لے کر آجاتے اور پریس کے کام سے مطمئن ہو جاتے۔ اعجاز پریس کی کاروباری وقعت آج بھی برقرار ہے سیاست اخبار اور انتخاب پریس کے بہت سے طباعتی کام اعجاز پریس میں انجام پاتے تھے اخبار سیاست سے اُن کے گہرے مراسم رہے اضلاع آندھرا پردیش اور اضلاع حیدرآباد دکن کے شاعروں، ادیبوں کی کتابیں بھی اعجاز پریس میں چھپ چکی ہیں تمام ادبی حلقوں میں اس پریس کا ایک بڑا نام ہے دیانت داری احساس ذمہ داری نے اعجاز پریس کی آبرو کو بڑھایا ہے نور محمد صاحب نے اپنے بھروسہ اور اعتماد کی شہرت کی ہے۔ ہم نے اپنے بہت سے دوستوں کی کتابیں اعجاز پریس ہی میں چھپوائی ہیں مجھے کبھی بھی نور محمد صاحب نے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ نور محمد صاحب کی فراخ دلی سے بہت سے لوگوں نے فائدہ اُٹھایا۔ بہت کم اُجرت پر طباعتی کام انجام دیئے جاتے تھے نور محمد اپنے بڑوں کا احترام کرتے تھے اپنے ہم عمر لوگوں سے نسبتاً زیادہ کھل کر گفتگو کرتے اور اپنے مراسم کو استوار رکھتے تھے۔ نور محمد کی زندگی میں بھی بہت سے لوگوں کی طرح کچھ نشیب و فراز آئے لیکن انہوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی ساکھ کو برقرار رکھا۔ اپنی ذمہ داریوں کو

دیانت داری کے ساتھ پورا کیا۔ ان کا رویہ ہمیشہ متوازن رہا۔ ان کے اعتدال پسند انہ مزاج ، بہت سے مرحلوں میں ان کا سچا معاون ثابت ہوا۔ تمام دوستوں اور اہل خاندان کے ساتھ اپنے مراسم کو قائم رکھا۔ نور محمد، مجھے اور میرے بعض ہم خیال دوستوں خاص طور پر رئیس اختر اور مومن خان شوق کو اپنے قریب سمجھتے تھے میرے دوستوں سے متعلق کوئی بھی طباعت کا کام ہوا اس کو اولیت دیتے اور ہر وقت ان کی کتابیں یا جو کچھ بھی پریس کے حوالے کیے جاتے وقت مقررہ پر تکمیل پاتا۔ بلکہ شریف کے سجادہ مولانا سید شاہ ابراہیم قادری سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے عرس شریف سے متعلق جو کچھ بھی طباعت کا کام ہوتا اعجاز پریس کے حوالے کرتے تھے (اب اُن کے بھتیجوں نے اس روایت کو برقرار رکھا ہے) جہاں تک میری معلومات ہیں چھتہ بازار میں اعجاز پریس سب سے زیادہ مشہور پریس ہے۔ نور محمد نے اپنے والد محترم کی روایت کو باقی رکھا۔ اپنے والد کے ملنے والوں اور اُن کے شاگردوں سے بے حد ادب و احترام سے ملتے تھے۔ اعجاز پریس اپنی اعلیٰ روایات کا آج بھی ترجمان ہے نور محمد صاحب کے انتقال کے بعد کچھ دنوں پریس کی رفتار سست رہی لیکن بتدریج پریس معمول پر آ گیا۔ نور محمد صاحب کے چھوٹے بھائی ممتاز محمد کی زیر سرپرستی و زیر نگرانی نور محمد کے فرزندان اکرام محمد اور ارشد محمد نے کاروبار کو سنبھال لیا ہے نور محمد صاحب کے دونوں بیٹے بے حد با اخلاق ذمہ دار اور فرض شناس ہیں پریس میں زیادہ تر بڑے بیٹے اپنا

وقت دیتے ہیں دونوں لڑکے اپنی تعلیمی مصروفیات کو برقرار رکھتے ہوئے پریس کے کاموں میں بھی کافی وقت دیا کرتے ہیں سید ممتاز محمد کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے انہوں نے اپنی سرپرستی میں اعجاز پریس کی ساکھ کو باقی رکھا۔ ان کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے اعجاز پریس کے کاروبار رواں دواں ہیں۔ وہ پریس کا ہی نہیں اپنے دونوں بھتیجوں کا بھی خیال رکھتے ہیں بہت کم عرصہ میں خاص طور پر نور محمد کے بڑے بیٹے نے پریس کے تمام کاروبار سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی ہے اعجاز پریس میں میں نے ادھر ۳۵ برسوں میں سو سے زیادہ کتابیں چھپوائیں۔ کسی ایک کتاب کے سلسلے میں کہیں بھی حساب فہمی میں غلط فہمی کی صورت پیدا نہیں ہوئی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طباعت کا کام جاری رہا۔ میں اپنا ادبی رسالہ خوشبو کا سفر" اعجاز پریس میں ہی چھپواتا ہوں۔ یہ پرچہ کی مسلسل اشاعت کے چھ سال ہو چکے ہیں اس عرصہ میں ایک شمارہ بھی مقررہ تاریخ کے بعد شائع نہیں ہوا بلکہ مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے پرچہ چھپ جاتا ہے نور محمد صاحب کی وضع داری اور شرافت کے بہت سے واقعات میں ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ نامور سینیئر کاتب محمد جعفر صاحب گذشتہ کئی برسوں سے پریس کے ایک حصہ میں کتابت کا کام انجام دے رہے ہیں ان کی موجودگی کبھی بھی پریس کے کاروبار میں حائل نہیں رہی۔ ایک اور نوجوان کاتب محمد یوسف بھی پریس میں کتابت کرتے ہیں ان کی نشست کے لیے بھی موزوں جگہ کا انتظام کیا گیا ہے کئی برسوں تک شفیع اقبال نے بھی پریس کے ایک حصہ میں اپنی نشست

محفوظ کر لی تھی ان کے ساتھ بھی نور محمد صاحب کا تعاون رہا۔ نور محمد ہنس مکھ بھی تھے، سنجیدہ مزاج بھی۔ پریس میں آنے والوں کے مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے محوِ تکلم رہتے تھے کوئی ایک شخص بھی ان کے پریس سے بے خبر یا بے تعلق نہیں رہا۔ نہایت ذمہ داری کے ساتھ پریس کے کام جاری تھے آج بھی جاری ہیں نور محمد کے ۵ بھائی ہیں جن کے نام یہ ہیں سید معراج محمد، سید اعجاز محمد سید منظور محمد، سید ممتاز محمد۔ ان کے والد محترم جامعہ عثمانیہ کے مشہور اساتذہ میں شامل تھے ادارہ ادبیات اُردو سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا بانیٔ ادارۂ ادبیات اُردو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے خاص رفیق کار تھے جن کی خدمات سے ادارہ نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ پروفیسر سید محمد صاحب ادارہ کی کئی کمیٹیوں میں شامل رہے۔ انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چھتہ بازار میں اعجاز پریس خاص طور پر اہلِ علم قدیم و جدید حضرات کے لئے ایک مرکزیت کی حیثیت رکھتا ہے اس پریس میں علمی و ادبی اور شعری مجموعوں کے علاوہ سرکاری کام بھی خوش اسلوبی اور ذمہداری کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔

میں جب بھی اعجاز پریس جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نور محمد صاحب پریس میں موجود ہیں نور محمد صاحب میری بے حد عزت کرتے تھے جیسے ہی پریس پہونچ جاتا کھڑے ہو کر مجھ سے ملتے۔ میرا احترام کرتے تھے پتہ نہیں میری زندگی کا کونسا رخ انہیں پسند تھا نور محمد ان جواں مرگ لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو آئینہ کی طرح صاف و شفاف رکھا۔ خدا اس نیک انسان کی مغفرت کرے

امباجی راؤ شاد

پولیس آفیسر کی نرم و نازک شاعری

دانشورانِ شعر و ادب کا یہ کہنا درست ہے کہ ہر انسان کی زندگی پر اس کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔ انسان چاہے کسی بھی ماحول کا پروردہ کیوں نہ ہو اس کا عکس اس کی زندگی میں مل جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ ہمیشہ اچھے لوگوں کے ساتھ رہنا چاہیئے۔

ایک ایسا شخص جو فطرتاً خوشگوار اور پسندیدہ ماحول سے وابستہ رہا ہو اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ روشنی کا سرچشمہ بنا رہتا ہے۔ امباجی راؤ شاد بھی ایسے ہی ماحول کے ترجمان تھے۔ جہاں سچائی، ہمدردی، مروت، رواداری اور انسان دوستی کا درس دیا جاتا تھا۔ ان کا بچپن تہذیبی سرگرمیوں سے وابستہ رہا۔ ان کی ذہنی تربیت ایک ایسے روشن دور کی دین تھی جس میں اجالے ہی اجالے ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی

نصف صدی پہلے کا حیدرآباد اپنی گوناگوں خصوصیات کے لئے منفرد رہا ہے۔ امباجی راؤ شاد کی زندگی کا ہر دور سرگرم عمل رہا۔ بچپن سے جوانی تک اور جوانی کے بعد کے مرحلوں میں بھی ان کے دل و دماغ کو روشنی ملتی رہی۔ امباجی راؤ سے میری ملاقات میرے دوست ممتاز گلوکار وٹھل راؤ کی قیام گاہ پر ہوئی۔ وٹھل راؤ اپنے کسی بیرونی ملک کے دورہ کے سلسلے میں مجھ سے ضروری مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ وہیں پر میری ملاقات کویتا کرن سے ہوئی (جو اردو لکھنا پڑھنا جانتی ہیں) کویتا کرن حیدرآباد کی ایک ہونہار باصلاحیت شاعرہ ہیں جن کے تاحال چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ امباجی راؤ شاد کی دختر نیک اختر ہیں۔ مجھ سے مشورہ سخن کیا کرتی ہیں۔ وٹھل راؤ نے کویتا کرن کی شاعرانہ سرپرستی و رہبری کے لئے مجھ سے خواہش کی تھی (یہ بات ۱۲ سال پہلے کی ہے) کویتا کرن کی وجہ سے امباجی راؤ صاحب سے میرے مراسم بڑھنے لگے۔ امباجی راؤ صاحب حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرنے والے ایک ممتاز شہری تھے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک اہم عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں اس کے باوجود وہ اپنی شاعری کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنی کچھ غزلوں کے ساتھ مجھ سے ملاقات کی اور خواہش کی کہ وہ مجھ سے مشورہ سخن کرنا چاہتے ہیں امباجی راؤ صاحب کو اردو زبان سے والہانہ وابستگی تھی۔ اچھی طرح اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مطالعہ کا

انہیں بہت شوق تھا۔ اردو کتابیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے خاص طور پر انہیں شعری ادب سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ ان کا کلام جب میری نظر سے گذرا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے جب کچھ غزلیں کہہ لیں تو مجھ سے کہا کہ ایک مختصر سا مجموعۂ کلام شائع کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں مبارکباد دی اور کہا کہ کچھ اور غزلیں کہہ لیجئے مجموعۂ کلام شائع ہوجائے گا۔ مشورۂ سخن کے دوران میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ ان کے خیالات کو برقرار رکھا جائے۔ ان ہی کے الفاظ میں اصلاح دیتا رہا۔ ان کے شاعرانہ مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی میں نے ان کے اشعار درست کئے۔ ان کے تقریباً تمام اشعار آسان اردو میں ملیں گے۔ ان کی شاعری سیدھے سادے لفظوں اور پُر اثر خیالات کی آئینہ دار ہے۔ ان کی زبان صاف ستھری ہے۔ ان کا کلام اردو کے صف اول کے اخبار سیاست میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ "خوشبو کا سفر" میں بھی شائع ہوتا رہتا تھا اس مجموعہ کی اشاعت نے ان کی برسوں کی خواہش کو پورا کیا ہے۔ امباجی راؤ شاد چاہتے تو ہندی رسم الخط (دیوناگری لپی) میں مجموعہ شائع کرتے لیکن انہوں نے اردو رسم الخط میں اشاعت کو اس لئے ترجیح دی کہ وہ اردو ماحول اور اردو تہذیب کے بہت دلدادہ تھے بہت ممکن ہے کہ وہ بعد میں اس مجموعہ کو ہندی رسم الخط میں شائع کرتے۔

غزل اردو شاعری میں تمام اصناف میں اپنا ایک منفرد مقام
رکھتی ہے ہر نیا شاعر اپنی ابتدائی شاعری کا آغاز غزل سے ہی کرتا ہے
امباجی راؤ شاد کی غزلیں رواں دواں بحروں میں ہیں بچپن کے
زمانے سے لے کر آج تک ان کا ایک بڑا حلقہ اردو دوستوں کا تھا۔ ان
کے احباب میں زیادہ تر لوگ اردو زبان سے محبت کرنے والے ملیں تھے۔
امباجی راؤ شاد ایک کھلے ذہن اور روشن خیال شاعر تھے تب ہی تو ان
کی شاعری میں انسان دوستی' آپسی بھائی چارگی' انصاف پسندی اور
وطن پرستی کے خیالات ملتے ہیں شہر کے ادبی حلقوں میں امباجی راؤ قدر کی
نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے شہر کی منتخب محفلوں میں کلام سنایا کرتے تھے،
۷ جون ۱۹۳۶ء کو محلہ لنگر حوض قلعہ گولکنڈہ (حیدرآباد) میں ایک اوسط طبقہ
کے تجارتی خاندان میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اردو میڈیم میں گولکنڈہ مستعد پورہ
اسکول میں ہوئی۔ پھر سٹی کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۵۲ء میں ایچ ایس سی کامیاب
کیا سیف آباد کالج سے انگلش میڈیم میں انٹرمیڈیٹ اور عثمانیہ یونیورسٹی
سے بی ایس سی کیا۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں سیول سب انسپکٹر آف پولیس منتخب ہوئے
۱۹۶۷ء میں سعید آباد پولیس ناکہ میں سب انسپکٹر لا اینڈ آرڈر مقرر ہوئے۔
اکتوبر ۱۹۸۹ء ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے عہدہ پر ترقی ملی۔ ۳۰ جون ۱۹۹۴ء
کو اڈیشنل سپرنٹنڈنٹ آف پولیس وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے
۱۹۸۰ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ امباجی راؤ کبھی کبھی ادارہ میرا شہر میرے
لوگ، سوغات، نظر، ایوان، نیرس، مستقل جام، شمع کے مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے امباجی راؤ کا
ایک اور مجموعہ کلام جلد ہی شائع ہونے والا تھا

سکندر علی وجد

(خوش لباس، طرحدار، دیدہ ور شاعر، فاضل جج، ممتاز عثمانین)

ایک ایسا شاعر جو وضع دار بھی ہو، طرحدار بھی، جاذب نظر بھی ہو دلکش بھی ہو اور پُراثر بھی۔ مردانہ حسن بھی رکھتا ہو اور عاشقانہ مزاج بھی، شاعرانہ طبیعت بھی رکھتا ہو، شائستہ صفات بھی، شائستہ و مہذب بھی ہو نازک مزاج بھی۔ نفاست پسند بھی ہو خوش لباس بھی ہو... خوش مزاج بھی ہو با اخلاق بھی ہو بامروت بھی، روادار بھی ہو۔ باکردار بھی، وقت شناس بھی ہو اور صداقت شعار بھی۔ شاہین نگاہ بھی ہو اور بلند پرواز بھی، معتبر بھی ہو اور باوقار بھی، دانشور بھی ہو اور باشعور بھی۔ ذہین و فطین بھی ہو اور صاحب فہم و ادراک بھی، صاحب علم و عرفان بھی ہو اور چشمۂ فیض رواں بھی۔ شائستہ پیکر بھی ہو اور مجسم اخلاص بھی، مرکزِ نگاہ بھی ہو رونقِ محفل بھی ہو، مہذب شہری بھی ہو، بااصول انسان بھی، محب وطن ہو وطن پرست بھی۔ شاعر بھی ہو، مفکر بھی، محقق بھی ہو اور تنقید نگار بھی

مبصر بھی ہو اور تجزیہ نگار بھی۔ چاہنے والا بھی ہو چاہے جانے والا بھی، عاشق
بھی اور معشوق بھی۔ مہذب معاشرہ کی عظیم شخصیت ہوا کرتی ہے جس کی
زندگی کا ایک ایک پل معطر رہتا ہے جس کے ذہن و فکر کی روشنی سارے
معاشرہ کو اچھائیوں کی سوغات سے سرفراز کرتی ہے۔ اس طرح کی اعلیٰ خصوصیات
کی حامل ایک شخصیت میرے ذہن و فکر کے افق پر زائد از ۴۰ برس سے جلوہ
افروز ہے اور اس شخصیت کا نام ہے سکندر علی وجد۔ جن کے عاشقانہ بانکپن
اور جن کی شاعرانہ کج کلاہی ان کے ہم عصر تمام شاعروں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے
فنونِ لطیفہ سے رشتہ رکھنے والے تمام کاتب اپنے اپنے میدان میں ناقابل فراموش کارہائے
نمایاں انجام دے چکے ہیں اور اس طرح کے فن کار سلسلۂ روز و شب کا ایک اہم حصہ رہتے
ہوئے اپنے اپنے منصب پر فائز ہیں جن کے علم و ہنر کی شمعیں آندھیوں
اور طوفانوں کی زد میں رہ کر بھی روشن ہیں۔ شاعروں میں حضرت امیر خسرو سے
لے کر سکندر علی وجد تک اور ان کے بعد کے شاعروں میں بھی بے شمار ایسے شاعر ہیں
جن کے علم و فن کی روشنی سے مہذب معاشرہ جگمگا رہا ہے (اور) بھی بے شمار ہنر مند ہوں
شاعروں، فن کاروں میں کچھ منتخب ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے فن کے امام رہے ہیں
جن کے فن کارانہ و قلمکارانہ عظمتوں کی خوشبو سارے معاشرہ میں پھیلی ہوئی ہے
ہر دور میں کچھ ایسے اردو شاعر بھی رہے ہیں جو تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکے
ہیں جن کی عظمتوں اور رفعتوں سے علمی و ادبی حلقے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں
ہر دور میں ہم عصر شاعروں کے فکر و فن کا ایک دوسرے کی شاعرانہ عظمتوں اور
رفعتوں کا تقابل کیا گیا ہے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا موازنہ کیا گیا ہے لیکن کچھ

شاعر ہر دور میں ایسے بھی رہے ہیں جو اپنی منفرد پہچان کے ساتھ تقابل اور موازنہ سے مبرا رہے ہیں۔ ہمارے نقادوں نے بڑے بڑے شاعروں کا تقابل و موازنہ ان کے ہم عصر شاعروں کے ساتھ کیا ہے اس کے باوجود ہر شاعر اپنی منفرد فکر اور اپنی خصوصی شاعرانہ اہمیت کے ساتھ شعری ادب میں محفوظ ہے تجزیہ نگاروں نے اپنے قلم کی جادوگری، سحر کاری اور ریسرچ کے لئے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے لیکن تجزیہ کی ایک منزل پر آکر انہیں ایک حرف آخر نے اس فیصلہ پر مجبور کیا ہے کہ ہر فنکار کی اہمیت و عظمت اپنی اپنی جگہ پر برقرار ہے۔ سکندر علی وجد کی شاعرانہ صلاحیتوں پر عصرِ حاضر کے بہت سے تجزیہ نگاروں نے خامہ فرسائی کی ہے لیکن نتیجتہً ان کے قلم کی تان اُس مقام پر ہی ٹوٹتی جاتی رہی جہاں فکر و فن کے آئینوں نے تبصرہ نگاروں کی شبیہ کو اپنے میں جذب کر لیا ہے سکندر علی وجد اپنے زمانے کے بلکہ عصرِ حاضر کے ایک ایسے منفرد شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے نظم نگار بھی تھے۔ ایلورہ۔ اجنتا اُن کی ایسی شاہکار نظمیں ہیں جن کا ان ۵ دہوں میں کوئی ثانی نہ بن سکا۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارت کی تعمیر کے وقت مزدوروں کے زبان سے یہ بات بھی کہلائی اجو زبان زد عام ہے

"کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے"۔

سکندر علی وجد کی شاعرانہ اہمیت و عظمت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لکھا جاتا رہے گا اور ایک ایسا شاعر جو ہمیشہ تجزیہ نگاروں، تبصرہ نویسوں تنقید پسندوں اور دانشورانِ شعر و ادب کی نظر میں رہا ہو اُس کے فکر و فن پر

لکھا جاتا رہے گا۔ فکر و خیال کے مختلف زاویوں کا جائزہ لیا جاتا رہے گا نظم نگاری اور غزل گوئی کا تقابل کیا جاتا رہے گا لیکن ہر مبصر کا آخری جملہ یہی رہے گا کہ سکندر علی وجد ناقابلِ فراموش شاعر ہیں۔ اس محترم شاعر کے بارے میں بیسیوں نے تمہیداً اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ میں نے حتی الامکان ان تمام تاثرات کو ضبطِ تحریر میں لایا ہے جو اس شاعرِ ذیشان کے شان میں پیش کیے جا سکتے تھے۔ ممتاز عثمانین سکندر علی وجد اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی بھرپور شاعرانہ شناخت کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ جامعہ عثمانیہ کے لائق و فائق سپوتوں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ یاد کیے جانے والے شاعر سکندر علی وجد بھی تھے۔ اسی دور میں انقلابی شاعر مخدوم محی الدین صاحب کا بھی طوطی بول رہا تھا لیکن یہ دونوں شاعر اپنی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ادب میں زندہ ہیں۔ سکندر علی وجد کا میں اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے سے ہی مداح رہا ہوں۔ میں نے اپنے شاعرانہ زندگی میں بے شمار خوش گو شاعروں کو سنا ہے لیکن سکندر علی وجد کا ترنم سب سے الگ اور اپنی مخصوص لے کی وجہ سے منفرد تھا۔ ان کی ایک غزل جو میں نے تقریباً ۴۰ سال پہلے یوم جمہوریہ ہند کے مشاعرے میں سنی ہوئی غزل کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے سنی تھی۔ جس کا مرصع مطلع اور ترنم آج بھی میرے سینے کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ وہ مطلع ہے۔

وہ آئے مرے پاس کانٹوں پہ چل کے ⁛ غمِ زندگی رہ گیا ہاتھ مل کے

سکندر علی وجد کا کلام اس مشاعرہ میں حاصلِ مشاعرہ رہا۔ میں نے بھی غزل جامعہ

عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی جوبلی مشاعرہ میں سنی تھی اسی مخصوص ترنم کے ساتھ ۔ یہ مشاعرہ بیلڈ ہی حیدر ری کلب کے میدان میں نہایت شاندار پیمانے پر ہوا تھا حیدرآباد کے منتخب شاعروں میں میں نے بھی ایک جونیر شاعر کی حیثیت سے کلام سنایا تھا مشاعرہ کی صدارت علامہ حیرت بدایونی نے کی تھی صدر شعبۂ اردو پروفیسر غلام عمر خان کنوینر مشاعرہ تھے ۔ سکندر علی وجد صاحب سے میری پہلی ملاقات مدراس کے ایک کل ہند مشاعرہ میں اس سے قبل ہوئی تھی اس مشاعرہ میں ملک کے تمام اہم شعراء ساحر لدھیانوی ، اختر الایمان ، کیفی اعظمی ، سردار جعفری ، جگن ناتھ آزاد ، سکندر علی وجد اور غالباً مخدوم محی الدین اور دیگر نمائندہ شاعروں نے کلام سنایا تھا اس مشاعرہ میں میرے علاوہ حیدرآباد سے ناصر کرنولی نے شرکت کی تھی ۔ ان دنوں میر حسن صاحب ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو مدراس تھے غالباً انہی کی دلچسپی سے ہم دو حیدرآبادی شاعر بھی مدعو تھے ۔ اس مشاعرہ میں میری اور ناصر کرنولی کی غزلوں کو بھی پسند کیا گیا ۔ شہ نشین عالیشان پیمانے پر سجایا گیا تھا ۔ میں نے اس دور میں اتنے بڑے کسی اور مشاعرہ میں کلام نہیں سنایا تھا ۔ شہ نشین کے دائیں جانب شعبۂ خواتین تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہزاروں خواتین موجود ہیں چلمن اس طرح آویزاں تھیں کہ خواتین دکھائی دیتی تھیں ۔ اُس زمانے میں میں "سیاست" میں مختلف شعراء کا کلام دیکھ لیا کرتا تھا ۔ مشاعرے کے تیسرے دن سکندر علی وجد "سیاست" آفس آئے ۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے ملاقات کی عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کا رشتہ سکندر علی وجد صاحب سے عثمانین ہونے

کی حیثیت سے بھی تھا وحید صاحب، عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کے قریبی دوست تھے جب وہ سیاست آئے تو عابد علی خان صاحب نے مجھے اپنے اجلاس پر بلوایا اور وحید صاحب سے بہت ہی اچھے انداز میں تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ صلاح الدین نیر حیدرآباد کے نوجوان شاعروں میں بہت اچھے شاعر ہیں انہیں نیر نہیں نا ئیر اور کبھی شاعر اعظم کہہ کر بلاتا ہوں میرے ادبی سکریٹری ہیں۔ وحید صاحب سے سلام علیک کے بعد عابد علی خان صاحب، وحید صاحب، جگر صاحب اور میں نے چائے پی اور وحید صاحب سے ان کا کلام سنا، وحید صاحب کے کلام سنانے سے پہلے جگر صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم پہلے کچھ شعر سناؤ۔ میں نے اپنی غزل کے کچھ شعر سنائے۔ وحید صاحب نے حوصلہ افزائی کی۔ وہ اپنی ایک مرصع غزل جس کا مطلع ہے

وہ آئے مرے پاس کانٹوں پہ چل کے یہ غم زندگی رہ گیا ہاتھ مل کے

لہک لہک کر سنائی۔ سارا کمرہ وجد آور ہو گیا۔ پھر وحید صاحب نے میری غزل سننے کے بعد یہ مشورہ دیا کہ تمہیں ترقی کرنا ہے ان شاء اللہ تم ترقی کرو گے لیکن جہاں تک بڑے مشاعروں میں غزل سنانے کی بات ہے کبھی تم ایسی غزل مت سناؤ جو ہم قافیہ ہم ردیف ہو یعنی ایسی غزل سناؤ جس میں قافیہ بھی ہو اور ردیف بھی۔ قافیہ اور ردیف والی غزل سامعین کو فی الفور متوجہ کرتی ہے میں نے ان کے مشورہ اور نصیحت کو دل کی گہرائیوں کے ساتھ قبول کیا۔ میں کل ہند مشاعروں میں ایسی ہی غزل سناتا ہوں جس میں قافیہ بھی ہو اور ردیف بھی۔ مدراس کے کل ہند مشاعرہ کے علاوہ ملک کے بعض ایسے کل ہند

مشاعروں میں بھی میں نے شرکت کی ہے جن میں وجد صاحب مدعو تھے۔

ادبی ٹرسٹ کے ابتدائی مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں ایک مشاعرہ جو نمائش میدان میں منعقد ہوا تھا جس کی معتمدِ مشاعرہ ڈاکٹر زینت ساجدہ تھیں (ڈاکٹر زینت ساجدہ اپنی منفرد تحریروں اور اپنی بہترین تقریری صلاحیتوں کی وجہ کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں) تقریباً تمام ترقی پسند شاعروں سے واقف تھیں ادبی ٹرسٹ کے اس مشاعرہ میں ملک بھر کے نمائندہ شعراء نے شرکت کی تھی۔ جب ڈاکٹر زینت ساجدہ نے سکندر علی وجد صاحب کو دعوتِ سخن دی تو انہوں نے ایک بہت ہی عمدہ غزل سنائی لیکن ایک دو شعر پر انھیں خاطر خواہ داد نہیں ملی جب وہ مقطع پڑھ کر بیٹھ ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے یہ شعر پڑھا۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ؞ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یہ شعر سنتے ہی وجد صاحب مائک پر آئے اور ناراض ہو کر کہا کہ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہمارے بعد یہاں اس طرح کا ماحول ہو گیا ہے۔ وجد صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت نازک مزاج انسان تھے۔ بقول شخصے "ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ انتہائی وضع دار اور طرح دار شاعر تھے وجد صاحب کی شاعری ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔ وجد صاحب نے اپنی شاعرانہ زندگی میں غیر معمولی شہرت پائی۔ انہوں نے تا دمِ زیست اپنے شاعرانہ بانکپن میں کمی آنے نہیں دی۔ ترقی پسند شاعروں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ حیدرآباد کے شاعروں میں علامہ حیرت بدایونی، مخدوم محی الدین اور

شاہد صدیقی سے ان کے گہرے روابط تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شخصی دلچسپی نے وحید صاحب کی علمی وادبی زندگی کو ارتقائی منزل سے ہم کنار کیا۔ اپنی قابلیت کی بنیاد پر جج سے سیشن جج ہوئے۔ رکن یا رٹیمیٹ ہوئے وحید صاحب ہندوستان کی شعری وادبی دنیا میں جتنے مقبول رہے اتنے ہی پاکستان کے ادبی حلقوں میں پسند کیے جاتے تھے وحید صاحب کی شاعری ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گی۔ حیدرآباد میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے بھی وحید صاحب کو بے حد لگاؤ تھا جب کبھی وہ حیدرآباد آتے ادارۂ ادبیات اردو (ایوانِ اردو) میں ان کے خیر مقدم میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ حیدرآباد میں ان کا قیام میر ہاشم علی خان کے ہاں زیادہ تر رہتا تھا۔ زندگی کے آخری دن انھوں نے اورنگ آباد میں گزارے۔ سرزمینِ اورنگ آباد نے سکندر علی وجد اور حمایت علی شاعر جیسے عظیم شاعروں کو جنم دیا۔ ڈاکٹر وحید اختر، اور قاضی سلیم اور بشر نواز کا نام بھی اسی سرزمین سے جڑا ہوا ہے۔ سکندر علی وجد صاحب کی حیدرآباد میں آمد کے سلسلے میں عابد علی خان صاحب کے دولت خانہ عابد منزل میں بھی محفلِ مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ وجد صاحب یوسف ناظم کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں ہاشم علی اختر، ڈاکٹر منان اور مولوی حبیب الرحمٰن سے بھی ان کے اچھے مراسم تھے اختر حسن صاحب، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر حسینی شاہد کے علاوہ اور بھی دانشوروں سے ان کی رسم وراہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک جامعہ عثمانیہ کی آن بان باقی رہے گی سکندر علی وجد کا نام بھی باقی رہے گا۔

عطا کلیانوی

(صوفی منش، کم آمیز، استادِ سخن)

ہمارے ادبی کلچر میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ کم آمیز اور گم نامی کی زندگی گزارنے والے قلم کاروں، فن کاروں، صاحبانِ علم و آگہی پر بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے۔ نہ جانے کتنی نامور ہستیاں ایسی رہی ہوں گی جو انتہائی صلاحیتوں کے باوجود اپنے وجود کا بھرپور احساس دلا نہ سکیں۔ اس میں کچھ تو اُن کی افتادِ طبع حائل رہی اور کچھ زمانے والوں کی بے اعتنائی۔ نظر انداز کیے گئے لوگ ہر شعبۂ حیات میں ملتے ہیں صرف شعبۂ فنونِ لطیفہ میں ہی نہیں۔ جب تک ہم میں بے حسی کارفرما رہے گی اس طرح کے احساسات سے ہمیں گزرنا پڑے گا۔ شہروں میں رہنے والے قلم کاروں، ہنرمندوں کو اگر وہ کم آمیز ہیں تو کچھ لوگ انہیں منظرِ عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں منظرِ عام پر لانے کے لیے اپنے نام اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اُن کی شناخت کے لیے کوشاں رہتے ہیں لیکن اضلاع اور مضافات میں رہنے بسنے والے

با صلاحیت لوگوں کی پذیرائی ہر دور میں ایک مسئلہ بنی رہی ہے پاسبانِ فکر و خیال اور اربابِ حل و عقد جن کا شعر و ادب اور اردو تہذیب کی دنیا میں زیادہ اثر ہے اُن کے لیے یہ ضروری ہے کہ گمنام اور کم آمیز قلم کارو کی تلاش کریں۔ اس پس منظر میں حضرت عطا کلیانوی، رشید احمد رشید جیسے قلم کاروں کا نام لینا چاہوں گا جن کے فکر و فن کی ادبی حلقوں میں جتنی قدر کی جانی چاہیے تھی نہیں کی گئی۔ لیکن "دیر آید درست آید" کے مصداق یہ بات میرے علم میں ہے کہ حضرت عطا کلیانوی اور رشید احمد رشید کی حیات اور کارنامے پر گلبرگہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالے لکھے گئے۔ اضلاع کے ان شاعروں کے علاوہ اور ان کے قرب و جوار کے علاقوں میں کچھ ایسے صاحبانِ قلم و قرطاس مل جائیں گے جن پر پاسدارانِ فکر و خیال کو توجہ کرنی چاہیے۔ حضرت عطا کلیانوی بسوا کلیان میں شعر و ادب کے چراغ روشن کرنے میں سب سے آگے رہے انھوں نے اپنی حیات تک بے شمار مشاعروں کا اہتمام کیا۔ بسوا کلیان میں مشاعروں کا ماحول بنایا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے عطا کلیانوی اُن بزرگ، فراخ دل اساتذۂ سخن میں سے ایک تھے جو نوجوانوں اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے کلیانی میں کئی مشاعروں کی سرپرستی کی۔ عطا کلیانوی سے میری پہلی ملاقات گلبرگہ میں آج سے ۳۵ برس پہلے بٹلی الاوہ میں ہر سال ہونے والے ایک سالانہ نعتیہ مشاعرہ میں ہوئی تھی اسی زمانے میں سردر مرزائی، عبدالرحیم آرزو، ڈاکٹر راہی قریشی، سلیمان خطیب اور صابر شاہ آبادی سے بھی ملاقات رہی اور ہم نے کئی مشاعرے ساتھ ساتھ پڑھے۔ عطا کلیانوی نے بسوا کلیان میں کئی مشاعرے منعقد کیے۔

بسوا کلیان میں حضرت خواجہ تاج الدین یاگ سوار؟ کے سالانہ عرس شریف
تقاریب کے سلسلے میں منعقدہ مشاعروں میں میں نے بھی شرکت کی ہے اِدھر
۱۰،۱۲ برسوں سے حضرت سید احمد شاہ قادری اعجازیؒ کے سالانہ نعتیہ و منقبتی
مشاعروں میں بھی شرکت کر رہا ہوں۔ بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ حضرت
سید احمد شاہ قادری اعجازیؒ کے مشاعرے ہوا کرتے ہیں اس مشاعرے کے انعقاد کے
سلسلے میں محمد مخدوم شاہ قادری اعجازی عرف شیخ چاند (شاہ آباد) کی شخصی دلچسپی کا
بہت بڑا دخل ہے درگاہ شریف سے وابستہ گورے میاں بھی کلیدی رول ادا
کرتے ہیں۔ عطا کلیانوی رباعی کے اہم شاعر ہیں۔ اضلاع حیدر آباد دکن کے
شاعروں میں یہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بہت عمدہ رباعیات کہی ہیں۔
عطا صاحب نے کلیان کی تاریخ پر بھی خامہ فرسائی کی ہے ضرورت اس بات کی ہے
کہ ان کے جو ادبی کام ادھورے رہ گئے ہیں اُن کو پورا کیا جائے۔ عطا کلیانوی صوفی
منش، خدا رسیدہ، منکسر المزاج، با اخلاق و با مروت اور نہایت شریف آدمی تھے
بسوا کلیان کے مشہور وکیل چاند پاشاہ عطا کلیانوی کے بے حد قدرداں ہیں
جب کبھی کلیانی کی شعری محفلوں کا ذکر آتا ہے تو وکیل صاحب عطا کلیانوی کی علمی و دینی
خدمات کا ضرور تذکرہ کرتے ہیں۔ بسوا کلیان کے کچھ نوجوان شاعروں، ادیبوں
کو زبان و ادب سے دلچسپی ہے خدا کرے کہ ان کی یہ دلچسپی برقرار رہے۔ جہاں
جہاں بھی اردو کے چراغ جل رہے ہیں ان کی روشنیاں باقی رہے۔ سرپرستانِ
زبان و ادب کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان چراغوں کی حفاظت کریں۔ اور ان کی
لو کو کم ہونے نہ دیں۔ اردو ادب و اردو تہذیب کو نقصان پہونچانے کے لیے

ہر دور میں تیز و تند ہوائیں چلتی رہی ہیں آج بھی اس طرح کا ماحول ہے لیکن جو چراغ جل رہے ہیں جلتے رہیں گے خدا ان کا نگہبان ہے یہ بہت پرانی بات ہے کہ عطا کلیانوی جب کبھی حیدرآباد آتے تو ان سے میری ملاقات ہو جاتی تھی میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں وہ میری شاعرانہ پہچان کے لیے ہمیشہ متمنی رہے۔ ہمیشہ نیک تمناؤں کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی شخصی دلچسپی اور شخصی دعوت پر میں نے بسوا کلیان میں بہت سے مشاعرے پڑھے ہیں عطا کلیانوی صاحب، رشید احمد رشید بیدر کی شاعرانہ قدر و قیمت کے معترف تھے سرور مرزائی کی شاعری کو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے حیدرآباد کے سینئر شعراء میں حضرت اوج یعقوبی سے بھی ان کے مراسم تھے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے ان کی ملاقات تھی جناب محبوب حسین جگر "سیاست" میں ان کا کلام شائع کرتے تھے۔ عطا کلیانوی عمر کے آخری زمانے میں بہت زیادہ اللہ والے ہو گئے تھے

میرا یہ مضمون اگرچہ تشنہ ہے ان کی شخصیت کے بعض گوشے چھوٹ گئے ہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ نذرانۂ عقیدت کے طور پر اس کتاب میں عطا کلیانوی کا بھی نام شامل رہے۔ ▲

رشید احمد رشید

(سرزمینِ بیدر کے نامور شاعر، ممتاز عثمانین، استادِ شعراء)

مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے ہر علاقے میں کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہیں جو اُس علاقے کی شہرت میں اضافہ کرنے کے لیے کلیدی رول ادا کرتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ جو بے شمار لوگوں میں اپنی منفرد شناخت کے ساتھ معاشرہ کا ایک اہم جز دیتے رہے۔ اپنے فن میں، اپنے ذہن و فکر کے دائرہ میں کچھ ایسے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیتے ہیں جو تاریخ کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ با صلاحیت لوگوں سے کوئی حصہ بھی خالی نہیں رہا۔ ایک عام آدمی اور ایک خاص آدمی کی پہچان کے لئے ان کے عادات و اطوار، ان کی صلاحیت و لیاقت اور ان کی سمجھ بوجھ کا جائزہ لیا جاتا ہے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعبہ سے تعلق رکھنے والے دوسرے شعبہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر اُسی معیار کے ساتھ دکھلا سکتا ہے۔ ہمیں بعض ایسے شاعر بھی ملیں گے جو بہترین نقاد، محقق اور بہترین مقرر ہیں شاعری کے ساتھ نثر نگاری

ہیں بھی انہوں نے نام کمایا ہے مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ مرزا غالب جہاں اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے وہیں اعلیٰ درجہ کے نثر نگار بھی تھے جس کا ثبوت ان کے خطوط سے ملتا ہے۔ حرف آخر یہ کہ اعلیٰ درجہ کا فن کار مختلف صلاحیتوں کے باوجود کسی ایک فن میں ہی شہرت رکھتا ہے۔ مرزا غالب شاعر کی حیثیت سے ہی آسمان کی بلندیوں تک پہونچ گئے ہیں ان تمہیدی جملوں کے پس منظر میں ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ میں کسی ایک فن کی شہرت کے ساتھ دوسرے فن کی حیثیت ضمنی ہو جاتی ہے فنونِ لطیفہ میں شاعری کے منصب تک کسی اور فن کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اگر تمام فنونِ لطیفہ کا جائزہ لیا جائے تو میدانِ ادب میں شاعری ہی اونچی اُڑان بھرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے حیدرآباد دکن کے علاقوں میں شہر سے ہٹ کر اضلاع حیدرآباد دکن میں بھی بہت سے نامور شاعر و ادیب گزرے ہیں اس وقت بھی بعض قلم کار ایسے موجود ہیں جو شعر و ادب کی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور احساس دلا رہے ہیں حیدرآباد دکن کے اضلاع میں ضلع بیدر بھی مختلف فنون میں شہرت رکھتا ہے۔ غیر معمولی صلاحیت رکھنے والی شخصیتوں نے سرزمین بیدر کو اپنے علم و فن سے مالامال کیا ہے بیدر میں جہاں تک اُردو شعر و ادب کا تعلق ہے کئی اہم قلم کاروں نے ادبی دنیا میں نام کمایا ہے جن میں ایک اہم نام رشید احمد رشید کا بھی ہے جب انہوں نے شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو اُس دور میں یعنی ۵۰ سال کے لگ بھگ زمانے میں جہاں میں نے حیدرآباد اور اضلاع حیدرآباد

کے بہت سے شاعروں، ادیبوں سے واقفیت حاصل کرلی اُن میں ایک اہم نام رشید احمد رشید کا بھی تھا۔ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں بیدر کے شاعروں میں صرف اور صرف رشید احمد رشید ہی ایک اہم شاعر تھے اُن کے بعد رئیس اختر (جن کا وطن بیدر ہے) اور محسن کمال نے شعر و ادب کی دنیا میں اپنی پہچان بنالی تھی۔ ان دنوں بیدر کی ایک ذہین و فطین شاعرہ ریحانہ بیگم بیدر کی ادبی تاریخ میں پہلی صاحب مجموعہ شاعرہ کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ اس علاقہ سے تعلق رکھنے والی ایک ادیبہ ڈاکٹر شفیعہ قادری بھی ہیں جن کی تین کتابیں تعارف (۱۹۸۶ء) حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے (۱۹۸۳ء) اور اردو تحریک آزادی سے قبل (۲۰۰۰ء) شائع ہو چکے ہیں ریحانہ بیگم کا پہلا مجموعۂ کلام پہلی کرن ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام آنگن آنگن پھول کے نام سے حال ہی میں منظرِ عام پر آچکا ہے بیدر کی ایک ذہین طالبہ ثنا ارم بھی افسانہ نگار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آچکی ہیں بہت ممکن ہے کچھ اور قلم کار بھی ہوں گے جن کی پہچان نہ بن سکی یا جنھوں نے اپنی پہچان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں لی ہو۔ بیدر کی سرزمین کا نام روشن کرنے والے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر رئیس اختر گذشتہ پچیس برسوں سے خاص طور پر حیدرآباد کی شعری و ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام کے حامل ہیں جن کا شعری و ادبی سفر پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے حضرت رشید احمد رشید، رئیس اختر کے پہلے استاد ہیں جن کی سرپرستی میں انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا۔ بعد میں انھوں نے شاہد صدیقی اور خورشید احمد جامی

جیسے جید اساتذہ سخن سے مشورہ سخن کیا۔ رئیس اختر اپنے پہلے استاد کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ رشید احمد رشید جامعہ عثمانیہ کے نامور نظم نگار شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد کے ہم عصر تھے اس دور میں جامعہ عثمانیہ کے شاعروں میں رشید احمد رشید نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے نامور طلبار اشفاق حسین میر حسن، عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کے علاوہ ہاشم علی اختر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج پیش کیا کرتے تھے۔ رشید احمد رشید نے مختلف اصناف سخن میں اپنی قابلیت و صلاحیت کے جوہر دکھلائے ہیں لیکن نظم گوئی ان کا خاص میدان ہے بہت زود گو شاعر تھے مزاج بھی شاعرانہ پایا تھا انہیں سنت حبیب سے عشق تھا پان بہت کھاتے تھے مزاج بھی شاعرانہ پایا تھا رشید احمد رشید سے میری ملاقات رئیس اختر کے توسط سے ہوئی تھی وہ ہم دونوں کی شاعرانہ شہرت سے بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ تم دونوں ہمارے علاقے (بیدر) کے ادبی سفیر ہو۔ ادبی حلقے واقف ہیں کہ حیدرآباد دکن کا ایک تعلقہ ہمنا باد میرا وطن ہے جس کا ضلع بیدر ہے رشید احمد رشید کے شاگردوں کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس دور کے جتنے لوگ بھی شعری ادب سے تعلق رکھتے تھے وہ رشید احمد رشید سے استفادہ سخن کرتے رہے ہیں۔ میں نے رشید احمد رشید کے ساتھ بیدر میں کئی مشاعرے پڑھے ہیں گلبرگہ، الند، ظہیر آباد، سنگاریڈی، رائچور کے مشاعروں میں بھی شریک رہا ہوں جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی وہ اپنی

نیک تمناؤں اور دعاؤں سے سرفراز کرتے تھے۔ ایک زمانے میں (۳۰ برس پہلے) بیدر میں بہت مشاعرے ہوتے تھے رئیس اختر نے بھی اپنی انجمن دیارِ ادب کے زیرِ اہتمام بڑے بڑے مشاعرے منعقد کیے تھے اُس زمانے میں مشاعروں کی سرپرستی کرنے والوں میں حکیم مرزا احمد بیگ افسر سب سے آگے رہتے تھے بلکہ اکثر دفعہ وہی مشاعروں کا انصرام کرتے تھے بیدر کے مشاعروں میں حیدر آباد کے نامور شعراء مخدوم محی الدین اوج یعقوبی، سلیمان اریب، خیرات ندیم، ابن احمد تاب، طالب رزاقی کنول پرشاد کنول وغیرہ بھی مدعو رہتے تھے اکثر مشاعروں میں میں بھی مدعو رہا ہوں۔ بیدر کے مشاعروں میں عطا کلیانوی، سلیمان خطیب، سرور مرزائی، صابر شاہ آبادی، عبدالرحیم آرزو اور ڈاکٹر راہی قریشی اور حکیم حیاتی بھی مدعو رہتے تھے۔ رشید احمد رشید صاحب حیدر آباد کے بعض مشاعروں میں مدعو رہے ہیں حیدر آباد کے مشاعروں میں بھی ان سے ملاقات رہتی تھی۔ جب کبھی وہ حیدر آباد آتے تو اپنے جامعہ عثمانیہ کے ساتھیوں خاص طور پر عابد علی خان اور محبوب حسین جگر سے سیاست آفس میں ملاقات کرتے۔ حیدر آباد میں سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ و مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہاشم علی اختر (جو ان دنوں امریکہ کے شہری بن گئے ہیں) نامور صحافی اختر حسن اور مشہور طنز و مزاح نگار رشید قریشی بھی ان کے خاص دوستوں میں شامل تھے کاہگر بس بیدر نے بی ایم پی وہم یادگار ناری جمعیوں نے بیدر سے مبرک کیا اور جو ظہیر آباد کے متوطن ہیں اپنے بزرگوں کی طرح رشید احمد رشید کی قدر و

منزلت کرتے رہے۔ ظہیر آباد کے نامور شاعر حکیم جالی سے بھی ان کی اچھی خاصی رسم و راہ تھی۔ رشید احمد رشید حیدرآباد میں ہاؤزنگ بورڈ کے آفس میں بھی ملاقات ہوتا تھی جہاں رئیس اختر بر سر خدمت تھے بعض دفعہ ہم تینوں (رشید احمد رشید، رئیس اختر، صلاح الدین نیّر) ایک ساتھ لنچ کیا کرتے۔ لنچ کے لیے شاہ بہار ہوٹل (نامپلی) ان کی پسندیدہ ہوٹل تھی رشید احمد رشید زندگی کے آخری دنوں میں بھی معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہے ویسے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ معاشی الجھنوں کا شکار رہا۔ رشید احمد رشید کا ایک مجموعہ کلام نجم آبرو کے نام سے شائع ہوا ہے کچھ عرصہ پہلے استاد اردو عثمانیہ یونیورسٹی ڈاکٹر حنیف سیفی نے رشید احمد رشید حیات اور کارنامے کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے یہ کام ڈاکٹر رزاق فاروقی صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کی شخصی دلچسپی سے ہوا۔ جب تک سرزمین بیدر میں خاص طور پر شعری و ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رہے گا رشید احمد رشید کا نام بھی قدر و منزلت کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔ ہماری یہ ادبی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کو خراج پیش کرتے رہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی شعبۂ حیات سے کیوں نہ ہو ◢

دامودر ذکی ٹھاکر

(کوڑنگل کے نامور کہنہ مشق شاعر)

دنیا کی کوئی زبان کیوں نہ ہو وہ کسی ایک خاص قوم، کسی خاص قبیلے، کسی خاص فرد کی میراث نہیں ہوتی، اگرچہ صدیوں سے کچھ لوگ کسی ایک مخصوص زبان سے نسلاً در نسلاً واسطہ رکھتے ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کے عالم و فاضل لوگ بھی اتنی اچھی انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی مادری زبان ہے جہاں تک ہندوستان اور ہندوستانی زبانوں کا تعلق ہے ملک کی تمام زبانوں میں اردو ہندی بلکہ ہندوستانی (زبان) اہم اور رابطہ کی زبانیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہندی کے مقابلے میں اردو زبان رابطہ کی زبان ہے یہ بھی صحیح ہے کہ ہر دور میں کسی ایک خاص زبان کا زیادہ چلن رہتا ہے ملک کی آزادی سے پہلے مسلم و غیر مسلم لوگوں میں بے شمار ایسے لوگ بھی تھے جو فارسی زبان سے بہت زیادہ واقف تھے۔ فارسی زبان سے واقفیت ان کے لیے ایک طرۂ امتیاز تھا لیکن ملک کی

تقسیم کے بعد فارسی کا چلن رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا گیا اب تو یہ حال ہے کہ فارسی جاننے والے بہت کم ہندوستانی رہ گئے ہیں نئی نسل کا تو اب یہ حال ہے کہ وہ اپنی مادری زبان سے بڑھ چڑھ کر انگریزی سے دلچسپی رکھتی ہے اردو زبان سے قربت رکھنے والے بہت سے ایسے لوگ رہے ہیں اور ہیں جنھیں اردو سے والہانہ دلبستگی رہی ہے (دلبستگی ہے) جن کے علمی و ادبی کارنامے کچھ اس قدر شاندار ہیں کہ ان کے نام اور ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس وقت بہ قیدِ حیات غیر مسلم دانشوروں میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ان جیسی قد آور شخصیتوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر اردو زبان وادب کی افادیت نامکمل کہی جاتی ہے اس طرح کے مشاہیر اردو سے حیدرآباد دکن کسی بھی دور میں خالی نہیں رہا۔ اس طرح کے باکمال لوگ صرف حیدرآباد کی حد تک ہی محدود نہیں رہے ہیں بلکہ اضلاع آندھرا پردیش اور اضلاع حیدرآباد دکن میں بھی رہے ہیں۔ وہاں کے قلم کاروں نے بھی اردو زبان وادب کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اگرچہ اس کی رفتار بہت کم ہو چکی ہے حیدرآباد دکن کے ایک قدیم تحصیل کوڑنگل کے ایک نامور شاعر دامودر ٹھاکر کو تاریخ ادب اردو کبھی بھی نہیں بھلا سکے گی۔ کوڑنگل کی سرزمین نے بہت سے نامور شخصیتوں کو جنم دیا ہے لیکن ادھر ۳۰، ۳۵ برسوں میں جو نام ہر شعری و ادبی حلقوں میں خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ ان میں ایک نام خلیل الرحمن سابق ایم پی اور ممتاز شاعر محب کوثر کا بھی رہے ہیں دامودر کی

سے شخصی طور پر بہت کم واقف ہوں البتہ میں اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں اُن کے نام سے واقف ہو چکا تھا مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی شاعرانہ عظمتوں کے کہاں کہاں چرچے ہیں کن کن ادبی حلقوں میں ان کے نام کا شہرہ ہے دامودر ذکی ٹھاکر کو فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے انھیں کوڑنگل کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں دیکھا اور سُنا تھا جو اُن کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں منعقد ہوا تھا اُس جشن دامودر ذکی ٹھاکر میں حیدرآباد کے تقریباً ۲۵ شاعروں نے شرکت کی تھی جن میں سینیئر شعراء کے ساتھ جونیئر شاعر بھی مدعو تھے جونیئر شاعروں میں راقم الحروف بھی شامل تھا حیدرآباد کے شاعروں کی قیادت کی ذمہ داری ممتاز شاعر کنول پرشاد کنول کو سونپی گئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کنول پرشاد کنول صاحب ایک بڑی ٹورسٹ موٹر میں ہم تمام شاعروں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے شایانِ شان پیمانے پر جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دامودر ذکی صاحب کے بہت سے شاگرد رہے ہیں ان کے تمام شاگردوں میں محب کوثر زیادہ نمایاں ہیں۔ محب کوثر اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں تقریباً ۱۳، ۱۴ برس تک دامودر ذکی صاحب سے شاعرانہ سرپرستی حاصل کی۔ محب کوثر کی شاعرانہ تربیت میں اُن کی استادانہ سرپرستی کا بہت بڑا دخل رہا ہے ان کے بعد محب کوثر صاحب ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ دامودر ذکی ٹھاکر ۲۰ اپریل ۱۹۰۳ء کو کوڑنگل (ضلع محبوب نگر) میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق بٹریلی ضلع

رتنا گیری کے دیشمکھ خاندان سے تھا خاندانی رقابتوں کی وجہ آپ کے والد کیشو رام پنت اور چچا باجی راؤ ، اندور ، گوالیار ، جھانسی وغیرہ سے ہوتے ہوئے تلاشِ معاش میں حیدرآباد آئے ۔ آپ کے چچا کوڑنگل پر اور آپ کے والد چنچولی پر بہ حیثیت گرداور متعین کیے گئے ۔ ۱۹۰۸ء میں جبکہ ذکی صاحب کی عمر صرف ۵ سال کی تھی ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ ذکی صاحب کی تعلیم و تربیت آپ کے چچا کی نگرانی میں کوڑنگل میں ہوئی ۔ ابھی ذکی صاحب پانچویں جماعت ہی کے طالب علم تھے کہ مولوی اسمٰعیل شریف صاحب آزل کے تلامذہ میں شامل ہو گئے ۔ تقریباً دو سال تک فنِ عروض سیکھتے رہے جب حبیب احمد ذکا کے پوتے حبیب اللہ وفا مدرس بن کر کوڑنگل آئے تو ذکی صاحب نے حضرت وفا سے شرف تلمذ حاصل کیا ۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ذکی صاحب سر رشتہ تعلیمات سے وابستہ ہو گئے اور دورانِ ملازمت لاہور سے منشی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا ۱۹۵۸ء میں کوڑنگل ہائی اسکول سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ذکی صاحب کا غیر مطبوعہ کلام پولیس ایکشن سے قبل تلنگانہ میں مقامی ہنگاموں کے دوران نذر آتش ہو گیا بعد کا کلام بھی ۲۶ مئی ۱۹۸۱ء کو سفر کے دوران تانڈور ریلوے اسٹیشن پر گم ہو گیا ۔ ۱۹۶۶ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام سفینۂ ذکی اور ۱۹۷۱ء میں دوسرا مجموعۂ کلام زاج شائع ہوا ۔ ذکی صاحب کی شخصیت اور فن پر جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم باسط خان نے زیر نگرانی ڈاکٹر سید محمود قادری ایم فل کی ڈگری حاصل کی ۔ ۸ ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کوڑنگل میں

۷۳ برس کی عمر میں رحلت کر گئے" (اقتباس : فرسادہ نوٹ۔ محب کوثر)

جشن تقاریب کے دوران میں نے محسوس کیا کہ داموور ذکی صاحب کو اُردو زبان وادب سے بے حد لگاؤ ہے کوڑنگل میں داموور ذکی کی زندگی تک شعر وادب کی محفلیں کچھ زیادہ ہی ہوا کرتی تھیں لیکن اب غالباً کسی بھی قسم کی ادبی سرگرمیاں جاری نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوڑنگل کے لوگ جو اُردو زبان اور اُردو شعر وادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تعطل کو دور کریں۔ محبوب نگر کے ممتاز شاعر نور آفاقی کے علاوہ رحمت کوثر اور حفیظ کیسر بھی ان کے شاگرد رہے ہیں داموور ذکی کے کلام کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہے کہ جہاں انہوں نے معیاری غزلیں کہی ہیں وہیں عمدہ رباعیات بھی کہی ہیں۔ ذکی صاحب کا نعتیہ کلام بھی پُر اثر ہے تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اضلاع کرناٹک کے ان کے ہم عصر شاعروں میں عطاؔ کلیانوی، رشید احمد رشید، سردر مرزائی کا نام لیا جاتا ہے ویسے صابر شاہ آبادی سے بھی شاعرانہ رسم وراہ تھی۔ داموور ذکی جیسے غیر مسلم شعراء کرام کو تاریخ ادب اُردو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

سُرورمرزائی

(قلندر مزاج ۔ بے نیاز شاعر)

معاشرہ میں وہ لوگ جو سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب کے ساتھ نہیں رہتے ۔ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب سے ہٹ کر رہتے ہیں منفرد شخصیت کے حامل رہتے ہیں ایسے لوگوں کی فکر، سوچ اور روش سب سے الگ رہتی ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کے لوگ جو خود اپنے ساتھ زیادہ رہتے ہیں وہ مغرور ہوتے ہیں اور اپنی ذات میں ہی گم رہتے ہیں جبکہ وہ فطرتاً مزاجاً ہی کچھ ایسا پاتے ہیں کہ وہ ہم میں رہتے ہوئے ہم میں شامل نہیں رہتے ۔ سرور مرزائی کا حال بھی کچھ اسی طرح کا تھا اپنے دور کے نامور صوفی شاعر تھے مجھے ۴۰ سال پہلے گلبرگہ کے مشاعروں میں ان سے ملاقات کا موقع ملتا رہتا تھا حضرت عطا کلیانی، صابر شاہ آبادی! ان کے قریب ترین احباب میں شامل تھے سرور مرزائی صاحب سے گلبرگہ میں سید احمد قادری کے زیرِ انتظام منعقدہ بشی الاوحہ کے سالانہ کل ہند مشاعرہ میں لازمی طور پر ملاقات ہوتی تھی ۔ مجھے یاد

ہے کہ سرور مرزائی صاحب سے میری ملاقات حضرت عطا کلیانوی کی معرفت ہوئی تھی سرور مرزائی صاحب کو زیادہ قریب سے محسوس کرنے والے شاہ آباد کے ایک مقبول شاعر صابر شاہ آبادی بھی تھے جو ان دونوں سینیئر و بزرگ شاعروں کے مقابلے میں جونیئر تھے مگر اُن دونوں (عطا کلیانوی، سرور مرزائی) سے بے تکلفانہ گفتگو روا رکھتے تھے صابر صاحب بذلہ سنج ہی نہیں تھے بلکہ وہ دکھ لہ کھا ؤ دے سے یہ احساس دلاتے تھے کہ وہ محفل میں موجود ہیں میں نے گلبرگہ بیدر، کلیانی کے مشاعروں میں ان تین شاعروں کو ساتھ دیکھا ہے طبائع مختلف ہونے کے باوجود وہ آپس میں ہم خیال تھے صابر شاہ آبادی ایک رواں دواں شخصیت کے حامل تھے لیکن عطا کلیانوی اور سرور مرزائی رک رک کر راستہ طے کرنے والی صوفیانہ مزاج کی حامل شخصیتیں تھیں ۔ حضرت عطا کلیانوی رباعی کے ایک اہم شاعر تھے ان کی شاعری میں زیادہ تر صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے سرور مرزائی بھی اپنے استاد عطا کلیانوی کے رنگ میں شعر کہتے تھے لیکن ان کا شاعرانہ مزاج بالکل الگ محسوس ہوتا تھا سرور مرزائی کی شاعری کی زبان اتنی عام فہم نہیں تھی کہ سننے پڑھنے والے داد دینے کے موقف میں رہیں ان کی شاعری غور و فکر کی دعوت دیتی ہے ان کے اشعار گہری معنویت لیے ہوئے ہوتے ہیں فارسی، عربی الفاظ کی آمیزش نے انھیں ایک مشکل پسند شاعر بنا دیا۔ سرور مرزائی نے اپنی منفرد شاعرانہ روش کو باقی رکھا۔ ان کے شاعرانہ مزاج میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اساتذہ سخن میں ان کا شمار ہوتا تھا مشاعروں میں ایک مجذوب شاعر کی طرح آتے تھے کہ تمام شعراء کی نظریں اُن پر جم جاتی تھیں۔

دل ودماغ کو جھنجھوڑنے والی ان کی ادق شاعری خاص طور پر کلاسیکی رنگ میں رنگے ہوئے شاعروں اور سامعین کے لیے ہوتی تھی عام آدمی کے لیے نہیں۔ بہت کم شعرا اور عوام سے داد وتحسین حاصل کرتے تھے لیکن وہ بے نیاز رہتے تھے۔ یہ کیا کم اعزاز کی بات ہے کہ علمی وادبی حلقے ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے آج بھی ان کی شاعری کے سامع اور قاری باقی ہیں جو ان کے لب ولہجہ کے مداح ہیں مجھے سرور مرزائی کی شاعری ہمیشہ پسند آئی۔ ان کے بعض شعر کچھ زیادہ ہی توجہ چاہتے تھے گلبرگہ کے مخصوص حلقوں سے ان کی وابستگی تھی مشاعروں اور ادبی محفلوں کی گہما گہمی سے دور رہتے تھے خانقاہی نظام سے دلبستگی رکھتے تھے انہیں مذہبی علوم وفنون سے خاصی دلچسپی تھی۔ زندگی کے آخری دنوں میں ایک صوفی منش اور مجذوب صفت خصوصیات کی حامل شخصیت بن گئے تھے سرور مرزائی نفیس، با اخلاق، شریف انسان تھے سرور مرزائی مجھ سے اتنے قریب نہیں تھے جتنے عطا کلیانوی اور صابر شاہ آبادی تھے لیکن ان کی شاعرانہ عظمتوں نے مجھے محصور کر دیا تھا۔ مجھے ان کی قربت کا احساس ہوتا تھا محسوس ہوتا تھا کہ دور رہ کر بھی نزدیک ہیں۔ ان کا میرا رشتہ دوستی سے شعر وادب سے زیادہ تھا سوا کلیان میں حضرت عطا کلیانوی کے زیر اہتمام مشاعروں میں ان کی شرکت لازمی رہتی تھی دونوں میں استاد وشاگرد کا ایک ایسا اٹوٹ رشتہ تھا کہ بعض مضامین سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہی ذہنیت کی ذہن ہیں۔ عطا کلیانوی کی شعر کی زبان سلیس اور آسان ہوتی لیکن سرور مرزائی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ متوجہ ہونا پڑتا ہے سرور مرزائی اپنے سے جونیر شاعروں سے مشفقانہ و سرپرستانہ

سلوک روا رکھتے تھے محب کوثر اور رزاق اثر ان سے جو سینئر شاعر ہیں لیکن ان کے
کلام کو برسرِ مشاعرہ سراہتے رہتے تھے۔ سرور مرزائی اچھے شعر پر کھل کر داد دیتے تھے
طبیعت میں سنجیدگی ہونے کی وجہ سے دورانِ مشاعرہ یہ کم محسوس ہوتا تھا کہ وہ
محفل کے روح رواں ہیں سینئر شاعروں کے ساتھ رہتے اور شاعرانہ وقار
کے ساتھ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھے رہتے۔ سرور مرزائی تحت میں کلام
سناتے تھے۔ بٹلی الاوہ کے نعتیہ مشاعرہ کے داعی جناب سید احمد قادری کے دولت خانہ
پر نہایت خلوص کے ساتھ مہمان شعراء کے ناشتہ کا انتظام رہتا تھا سرور مرزائی، عطا
کلیانوی، ماہر شاہ آبادی کے ساتھ ساتھ راقم الحروف اور حیدرآباد کے بعض
شاعر بھی رہتے تھے ان نعتیہ مشاعروں میں اس دور کے یعنی ۲۵ برس پہلے کے اضلاع
کے شاعروں میں رشید احمد رشید (بیدر) اور حکیم جمالی (ظہیرآباد) بہت کم دکھائی
دیتے تھے برخلاف اس کے میں نے بیدر اور ظہیرآباد کے اکثر شاعروں میں بھی
عطا کلیانوی، سرور مرزائی اور ماہر شاہ آبادی کو شرکت کرتے دیکھا ہے۔ ان کے
ساتھ کلام سنایا ہے ان شعرائے کرام سے میرا شاعرانہ رشتہ تقریباً ۴ برس پہلے سے
قائم ہے کلیانی میں حضرت تاج الدین باگ سوار کے مشاعروں میں میں نے شرکت کی
ہے ان مشاعروں میں سرور مرزائی شرکت کرتے تھے اور ایسے مشاعرے جو عرس
شریف تقاریب سے ہٹ کر عام دنوں میں ہوتے تھے ان مشاعروں کے انعقاد
کے سلسلے میں عطا کلیانوی کی دلچسپی کو بہت زیادہ دخل رہتا۔ ظہیرآباد کے مشاعروں
میں حکیم جمالی داعی محفل رہتے جو بزمِ سخن ظہیرآباد کے بانی اور کرتا دھرتا تھے۔
مشاعرہ کا سارا انتظام ان کے زیر اثر رہتا تھا۔ سرور مرزائی کسی کالج میں زیر تعلیم

نہیں رہے۔ لیکن کثرتِ مطالعہ نے انہیں مختلف علوم و فنون سے واقف کروایا۔ سرورِ مرزائی کا نام محمد مستان علی ہے لیکن ادبی حلقوں میں سرور مرزائی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ صوفی عین اللہ شاہ کے نام سے بھی ایک مخصوص حلقے میں ان کی پہچان ہے صوفیانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگ ان کے ہم مزاج تھے۔ ۲۴ ڈسمبر ۱۹۲۳ء کو ضلع محلع پیٹ تعلقہ چنچولی ضلع گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم صلح پیٹ میں ہوئی۔ صنعتی تعلیم کا ڈپلوما رکھتے تھے منشی کامیاب تھے۔ فارسی، مرہٹی اور ہندی سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے انگریزی تلگو سے بھی واقف تھے گلبرگہ میں شعبہ دستکاری میں معلم تھے ان کی بعض کتابوں پر ایوارڈز مل چکے ہیں۔ شاعری کی ابتدا ۱۹۴۲ء سے ہوئی۔ حضرت عطا کلیانوی سے انہیں شرفِ تلمذ رہا۔ اساتذۂ سخن کا کلام ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ مرزا غالب کا رنگ ان کی شاعری میں جھلکتا ہے حضرت دامودر ذکی جو ریاستِ حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے ان کے ہم عصر تھے نوجوان شعراء میں مجیب کوثر ان کے پسندیدہ شاعر تھے حیدرآباد کے شاعروں میں اوج یعقوبی کی شاعرانہ قدر و منزلت کو پورے عقیدت و احترام کے ساتھ تسلیم کرتے تھے ان سے اچھے دوستانہ مراسم تھے حیدرآباد کے بعض مشاعروں میں کلام سنا چکے ہیں جب کبھی سرور مرزائی حیدرآباد آتے تو اوج یعقوبی صاحب سے لازماً ملاقات کرتے۔ ۳۳ سال تک ملازمت کی یکم ڈسمبر ۱۹۷۵ء کو حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۰ اگست ۱۹۸۶ء کو انتقال ہوا۔ سرور مرزائی کے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں نشتر الدنابیل ۱۹۶۷ء، سبحا ذنامہ ۱۹۸۲ء شیون احمدی ۱۹۸۶ء فریاد الرشاد ۱۹۸۶ء پند و پیغام۔

اس کے علاوہ ان کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں۔ عمدہ قاعدہ۔ ملحات و قطعات تین کتابیں غیر مطبوعہ بھی ہیں جن کے نام یہ ہیں قاعدہ (فن عروض) مافی الضمیر (عرفانی قطعات) اور پنج رس۔ سرور مرزائی علم عروض کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے مجھے اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ شاعری میں ان کے کون کون شاگرد ہیں ـــــ زندگی کے آخری دہے میں وہ سب سے الگ الگ رہا کرتے تھے یعنی کم آمیز شخصیت بن گئے تھے مشاعروں میں بھی کم شرکت کرتے تھے۔ بزرگانِ دین کے عقیدت مند تھے مذہبی تعلیمات سے بہرہ ور تھے سرور مرزائی بھی گلبرگہ کے ان علم دوست، استادِ سخن میں شمار کیئے جاتے ہیں جن کا نام گلبرگہ کی شعری و ادبی تاریخ میں موجود رہے گا جہاں کہیں ان کی شاعرانہ عظمتوں اور ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا جائے گا مبصرین اس بات کو ضرور یاد رکھیں گے کہ سرور مرزائی سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے ۔

صولت محبوب نگری

(شعر نواز شخصیت، دلدادہ شعر و سخن)

آندھرا پردیش کے اضلاع تلنگانہ میں خاص طور پر کچھ اضلاع میں ایسے شاعر بھی گذرے ہیں اور موجود ہیں جو وسائل نہ ہونے کے باوجود بھی شعر و ادب کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں دلچسپی لیتے رہے۔ جہاں کہیں بھی شعر و ادب کے لیے ماحول سازگار ہو وہاں شعری محفلوں اور بڑے مشاعروں کا اہتمام کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ مشکل وہاں ہوتی ہے جہاں وسائل بھی کم ہوں اور لوگوں کو مشاعروں سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔ جہاں چراغ جل رہے ہوں وہاں چراغوں کی حفاظت آسان ہے لیکن وہاں چراغوں کی حفاظت مشکل ہے جہاں ہواؤں کی زد میں چراغ رہتے ہیں۔ ناموافق حالات میں شعر و ادب کا کام کرنا ہمت والوں کا کام ہوتا ہے اور یہ کام ایسے ہی لوگ کرتے ہیں جو زبان و ادب کی خدمت کا جذبۂ صادق رکھتے ہیں بعض ضلعوں میں شعر و ادب کا ماحول سازگار رہا ہے جن میں سے ایک محبوب نگر بھی ہے جہاں آج بھی محفلِ شعر، ادبی سرگرمیوں اور

مشاعروں کے فروغ کے لیے کچھ محبانِ اردو سرگرم عمل ہیں۔ محبوب نگر میں حضرت عبدالرزاق خان صولت ایڈوکیٹ کی ایک ایسی شخصیت تھی جو مشاعروں کے انعقاد سے دلچسپی رکھتی تھی جن کے زمانے میں بے شمار مشاعرے ہوتے تھے جن میں حیدرآباد کے صفِ اول کے شاعروں کے ساتھ ساتھ باصلاحیت نوجوان شاعروں نے بھی شرکت کی ہے صولت صاحب کے زمانے میں محبوب نگر میں مشاعروں میں بعض سینیر شاعروں میں عبدالعزیز عزیز، نصرت فاروقی کا نام بھی لیا جاتا ہے صولت صاحب کے دور میں محبوب نگر میں مشاعروں میں نہ صرف حیدرآباد کے شاعروں کو ہی مدعو کیا کرتے تھے بلکہ اضلاع کے شاعروں کو بھی مدعو کیا کرتے تھے ڈاکٹر علی احمد جلیلی اندازاً ۲۵ برس محبوب نگر میں رہے ہے جن کی وجہ سے بھی شعری و ادبی ماحول پروان چڑھتا رہا۔ صولت صاحب اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ متحرک رہے۔ چاہے سرکاری مشاعرہ ہو کہ غیر سرکاری مشاعرہ وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ میں نے صولت صاحب کی دعوت پر کئی مشاعرے پڑھے ہیں وہ شعر نغمت میں سنتے تھے اور خوب داد پاتے تھے صولت صاحب نے کئی برس تک شاعری کی شمع کو روشن رکھا اور اس کو ہواؤں کی زد میں آنے نہیں دیا۔ صولت صاحب کے تمام بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اب ان کے افرادِ خاندان بیرون ملک سعودی عرب وغیرہ میں مقیم ہیں۔ صولت صاحب کا گھرانہ تعلیم یافتہ گھرانہ ہے صولت صاحب نہایت وضع دار شریف النفس انسان تھے میں نے اپنی شاعرانہ زندگی میں صولت صاحب کو محبوب نگر میں شعروادب کی شمع کو روشن رکھنے میں ہمیشہ مصروف پایا۔ وہ جب کبھی محبوب نگر میں بڑا مشاعرہ

منعقد کرنے کے موقف میں رہتے تو حیدرآباد پہونچ جانے۔ سید مسعود سیاست آفس آتے اور اکثر دفعہ محبوب حسین جگر صاحب کے مشورہ سے حیدرآباد کے شعراء کا انتخاب کرتے تھے شعراء کو بڑے اہتمام سے مدعو کرتے ان کے آنے جانے کے لیے کار کا انتظام ہوجاتا گیسٹ ہاؤز میں ٹھہراتے اور ان کے طعام کا معقول انتظام کرتے تھے ان کے دور میں بعض شعراء جو مے نوشی کے عادی رہتے ان کے لیے بھی معقول انتظام ہوجاتا۔ بعض شعراء لازماً شریک جام و مینا رہتے تھے ایسے شعراء صولت صاحب کے لیے مشکلات پیدا کرتے تھے کیونکہ وہ شعراء مے نوشی کے بعد وقت مقررہ پر مشاعرہ گاہ نہیں پہونچتے تھے جس کی وجہ سے انتظامی حیثیت سے وہ پریشان ہوجاتے تھے اس کے باوجود ان کے مشاعرے کامیاب رہتے تھے محبوب نگر کے مشاعروں میں سید شہیدی، علی احمد جلیلی، طالب رزاقی اوج یعقوبی، خیرات ندیم کے علاوہ راقم الحروف نے کئی مشاعروں میں شرکت کی بعض مشاعروں میں، میں نے شاہد صدیقی، سلیمان اریب اور ابن احمد تاب کو بھی دیکھا ہے۔ اُس دور میں طالب رزاقی، خیرات ندیم، سید شہیدی خوش گلو شعراء کی حیثیت سے بہت شہرت رکھتے تھے جو فرمائش پر ایک سے زائد مرتبہ اپنا کلام سناتے تھے۔ ٹاؤن ہال (مشاعرہ گاہ) شائقین مشاعرہ سے بھرا ہوا رہتا تھا۔ محبوب نگر کا ہر مشاعرہ کامیاب رہتا تھا محبوب نگر کے لوگوں کو مشاعرہ سننے کا بے حد شوق ہے آج بھی مشاعروں میں ٹاؤن ہال کی تمام کرسیاں بھری ہوئی رہتی ہیں مشاعرے کبھی بھی بدنظمی کا شکار نہیں ہوئے۔ صولت صاحب کے زیر اہتمام منعقدہ تقریباً ہر

مشاعرہ میں میں نے شرکت کی ہے اپنے دور کے تمام اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ شہر کی معزز شخصیتوں (بلا تخصیص مذہب و ملت) سے ان کے مراسم تھے اس زمانے میں نصرت فاروقی انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے جو اردو کے مسائل سے پوری ذمہ داری کے ساتھ دلچسپی رکھتے تھے صولت صاحب کے رفقائے کار ان سے مکمل تعاون کرتے تھے۔ صولت صاحب کو میں نے ہمیشہ سید یرگہ کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے دیکھا ہے۔ عصائے پیری ایک رفیق دیرینہ کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا۔ "سیاست" آتے تھے تو سب سے پہلے جگر صاحب سے ملاقات کرتے تھے مشاعرہ کا سلسلہ ہو تو جگر صاحب مجھے آواز دیتے اور کہتے صولت صاحب آئے ہیں محبوب نگر میں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں ان سے تعاون کرو اکثر دفعہ جگر صاحب کے اجلاس پر ان کی موجودگی میں حیدرآباد کے شعراء کا انتخاب کیا جاتا تھا کبھی کبھی صولت صاحب میری نشست تک آجاتے اور شعراء کو مدعو کرنے کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا جاتا۔ جب فہرست مکمل ہو جاتی تو میں پوری ذمہ داری کے ساتھ شعراء کو مدعو کرتا اور ہم مقررہ وقت پر بذریعہ کار محبوب نگر پہونچتے تھے زیادہ تر گیسٹ ہاؤز میں طعام کا انتظام رہتا تھا ایک دفعہ یوں ہوا کہ ڈنر میں شعراء کے لیے میٹھا کم پڑ گیا۔ صولت صاحب پریشان دکھائی دینے لگے۔ مشاعرہ کا وقت قریب آرہا تھا چاہتے تھے کہ شعراء بر وقت مشاعرہ گاہ پہونچیں۔ بہرحال ڈنر کے بعد شعراء کے سامنے میٹھا پیش کیا گیا تو پلیٹ میں

بہت کم میٹھا تھا منتظمین مشاعرہ نے پیچھے سے میٹھا پھیلا دیا تھا خیرات ندیم بہت زندہ دل شاعر تھے انہوں نے جب دیکھا کہ صرف دو چمچے میٹھا ان کی پلیٹ میں پھیلا دیا گیا ہے تو خیرات ندیم صاحب نے صولت صاحب کو بلوایا اور کہا میٹھا کہاں ہے؟ صولت صاحب نے کہا کہ میٹھا آپ کے سامنے ہے خیرات ندیم صاحب نے کہا کم مقدار میٹھے کو کچھ اس طرح پھیلا دیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ پلیٹ پر پینٹنگ کی گئی ہے زبردست قہقہہ سے ماحول زعفران زار ہو گیا۔ صولت صاحب شرمندہ ضرور ہوئے لیکن انہوں نے خیرات ندیم صاحب کی بات کا برا نہیں مانا۔ صولت صاحب نہایت وضع دار اور بے حد مخلص اور ادب نواز شخصیت تھے صولت صاحب نے اپنی زندگی میں بزم سخن کی بنیاد ڈالی تھی جو آج بھی کام کر رہی ہے ان کے فرزند محمد نذیر احمد خان نیر اس بزم سخن کے سربراہ ہیں اپنے والد محترم کی روایت کو باقی رکھتے ہوئے بزم سخن کی جانب سے کبھی کبھی شعری محفلوں کا انعقاد عمل میں لاتے ہیں مجھے اس بات کا پوری طرح علم نہیں ہے کہ محبوب نگر میں صولت صاحب کے ہم خیال محبان اردو کون کون ہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ نصرت فاروقی ایڈوکیٹ نے بھی اردو زبان کے مسائل کے سلسلے میں بہت سے جلسے انجمن ترقی اردو کی جانب سے منعقد کیے۔ محبوب نگر کے متوطن وزیر اوقاف جناب ابراہیم علی انصاری کے دور میں بھی انجمن ترقی اردو کی بہت سی تقاریب ہوئیں۔ جناب عابد علی خان مدیر سیاست، شریک معتمد و نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے کئی بار محبوب نگر کے اردو جلسوں میں شرکت کی۔ اس بات سے انکار نہیں

کہا جا سکتا کہ ہر دور میں کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے نام اور کام سے لوگ واقف رہتے ہیں۔ محبوب نگر کے ادبی ماحول کا جہاں کہیں بھی ذکر آتا رہے گا وہاں عبدالرزاق خان صولت صاحب کا نام بھی ضرور لیا جائے گا میں نے اپنی شاعرانہ زندگی میں جب سے مشاعرے پڑھنا شروع کیے اُس وقت سے صولت صاحب کی حیات تک محبوب نگر میں صولت صاحب کو مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں سرگرم عمل پایا۔ میں نے ہمیشہ ایسے بزرگانِ شعر و ادب کی دل و جان سے عزت کی جو زبان و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ مجھے صولت صاحب اس وجہ سے بھی یاد ہیں کہ انہوں نے محبوب نگر میں مشاعروں کی وساطت سے اُردو کی شمع کو روشن رکھا وہ شمعِ اُردو ایک کامیاب تسلسل کے ساتھ آج بھی جل رہی ہے۔

ایک سیدھے سادے انسان کو پُر وقار بنا دیتی ہے وضع دار لوگ سنجیدہ، متین اور صلح کل مزاج کے حامل ہوتے ہیں ہر آسان اور مشکل موقع پر قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ شخصیتوں کے تعین کا ہے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وضع داری کہیں تصنع، بناوٹ اور ظاہرداری جیسے غیر مبہم، غیر درست صورتحال سے نزدیک تو نہیں ہے؟ اچھے بُرے انسان کی پہچان بہت مشکل ہے زندگی کے سفر میں ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے کہ وضع دار شخص اپنی وضع داری کی اعلیٰ صفات سے مزین ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسے حالات کا شکار ہو جاتا ہے جس سے اُس کا اعتبار کم ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض وضعدار شخصیتیں کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں اپنی روش پر قائم رہتے ہیں اور اپنی ساری زندگی کو پُر وقار انداز میں گزارتے ہیں صحیح معنوں میں جن شخصیتوں کو وضع داروں کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے ان میں ایک نام محبوب نگر کی سربرآوردہ شخصیت نامور شاعر و صحافی عبدالعزیز عزیز کا بھی ہے عزیز صاحب یکم اکٹوبر ۱۹۲۲ء کو محبوب نگر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں میٹرک کامیاب کیا اور ۱۹۴۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ میں عبدالعزیز عزیز صاحب کو زائد از ۴۰ سال سے جانتا ہوں۔ عزیز صاحب سے میری شناسائی محبوب نگر میں کل ہند مشاعرے کے سلسلے میں ہوئی تھی اُس زمانے میں غلام دستگیر قریشی صاحب محبوب نگر کے کلکٹر تھے اس مشاعرہ میں حسرت جے پوری، احمد ضیا، قاضی انجم بھی شرکت کی تھی حیدرآباد سے تقریباً ۱۲، ۱۴ شاعر مدعو تھے عزیز صاحب اس مشاعرہ کے کنوینر تھے حیدرآباد کے مقبول و مشہور شعراء میں سینیر شاعر بھی مدعو تھے اور جونیر شاعر بھی۔

ایم۔ اے۔ عزیز

محبوب نگر کی سربرآوردہ شخصیت۔ شاعر و صحافی

وضع داری نے ہمیشہ شخصیت کی نشو و نما میں اہم رول ادا کیا ہے جہاں کہیں بھی کسی شخصیت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے "فلاں شخص وضع دار ہے" تو اس سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ وہ شخص نیک صفت، اصول پسند، دیانت دار، بامروت، مہذب، معتبر اور پُر وقار ہو گا۔ وضع داری کسی انسان کی اعلیٰ خصوصیات اس کے رکھ رکھاؤ اور معاشرہ میں اس کی اعلیٰ حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ وضع داری سے یہ بھی مطلب نہیں لیا جاتا ہے کہ کوئی شخص صرف اپنے مخصوص لباس، شرافتِ نفس اور اپنی ملنساری سے ہی دوسروں کے دل جیت لیتا ہے بلکہ یہ زیادہ صحیح ہے کہ وضع داری ایک مخصوص شخص کی تمام اعلیٰ و ارفع خوبیوں کو اجاگر کر دیتی ہے۔ اگر ہم سنجیدگی سے جائزہ لیں تو ہمیں اپنے معاشرہ میں بہت سے وضع دار لوگ مل جائیں گے۔ لیکن ان کی پہچان کے لیے ان کے پس منظر، ان کے پیش منظر اور ان کی زندگی کے سارے لمحات کا تجربہ بھی ضروری ہے وضع داری

وہ مشاعرہ اس لیے بھی یادگار رہا کہ رات کے ایک بجے کے بعد شروع ہوا راستے میں موٹر کار خراب ہونے کی وجہ سے حیدرآباد کے شاعر کافی دیر سے پہنچے۔ شعراء کے انتظار میں اس خیال سے کہ شعراء نہیں آئیں گے۔ مشاعرہ کی برخواستگی کا اعلان کیا گیا لیکن بعد میں مشاعرہ ہوا۔ عزیز صاحب بہت پریشان رہے۔ اس حادثاتی مشاعرہ کے بعد عزیز صاحب سے پتہ نہیں کہاں کہاں ملاقات ہوتی رہی لیکن اُس وقت زیادہ ملاقات ہوتی رہی جب ابراہیم علی انصاری (متوطن محبوب نگر) ریاستی حکومت کے وزیر اوقاف تھے۔ ابراہیم علی انصاری صاحب کے خاص دوستوں میں عزیز صاحب کا شمار ہوتا تھا ابراہیم علی انصاری ایک زمانے میں محبوب نگر میں شعر و ادب کی محفلوں کی جان تھے انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس اور مشاعرہ بھی بڑے اہتمام سے منعقد کیا گیا تھا۔ ان تقاریب میں شریک تھا عابد علی خان صاحب مدیر سیاست نے بھی جو ان دنوں انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد تھے شرکت کی تھی۔ نصرت فاروقی ایڈوکیٹ معتمد انجمن ترقی اردو محبوب نگر نہایت فعال و متحرک شخصیت کے حامل تھے اُس زمانے میں محبوب نگر کے بزرگ سینیر شاعر عبدالرزاق صولت ایڈوکیٹ بھی انجمن کی سرگرمیوں اور مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں سرگرم حصہ لیا کرتے تھے عزیز صاحب سے سکریٹیریٹ میں بھی ملاقات ہوتی تھی وہ ابراہیم علی انصاری صاحب سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ اتفاق سے میرے محکمہ پنچایت راج کے اکاؤنٹس سکشن کے قریب انصاری صاحب کا اجلاس تھا انصاری صاحب سے میری بھی اچھی خاصی ملاقات تھی انصاری صاحب سے کبھی کبھی برسرِ راہ ملاقات ہوا کرتی تھی انصاری صاحب نہایت

سبک خرام، کم گو، شریف النفس انسان تھے انتہائی نیک نامی کے ساتھ انہوں نے اپنی وزارت کے فرائض انجام دیئے۔ عزیز صاحب اُن دنوں اکثر سیاست آفس آتے تھے عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے ملاقات کرتے تھے اگر میں نظر آتا تو مجھ سے بھی مل لیا کرتے تھے عزیز صاحب مخلص، صاف گو، صاف طینت، نیک دل وضع دار شخصیت کے حامل تھے عزیز صاحب کی وضع داری نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کی وضع داری کا اتنا گہرا اثر مجھ پر مرتب ہوا کہ میں کئی برسوں کی ملاقات کو آج بھی تازہ رکھے ہوئے ہوں عزیز صاحب بہت ہی عمدہ شاعر تھے حیدرآباد میں خاص خاص محفلوں میں دکھائی دیتے تھے محبوب نگر کے تمام اہم مشاعروں میں جو ٹاؤن ہال میں منعقد ہوتے تھے انہیں میں نے ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ حیدرآباد کی محفلوں میں (ادارۂ میرا شہر میرے لوگ، سوغات نظر اور جامی میموریل اکیڈیمی) شرکت کرتے تھے اور اپنے کلام سے محظوظ کیا کرتے تھے عزیز صاحب کا کلام سیاست میں شائع ہونے کے علاوہ خوشبو کا سفر میں بھی شائع ہوتا رہتا تھا حیدرآباد میں ڈاکٹر حسن الدین احمد، استادِ سخن ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے انہیں شرف تلمذ حاصل تھا کلام تحت میں سناتے تھے سوغات نظر کی جانب سے کچھ عرصہ پہلے ان کی شاعری و شخصیت کے موضوع پر ادبی اجلاس کا اہتمام کیا گیا تھا عزیز صاحب غزلوں کے علاوہ عمدہ نظمیں بھی کہتے ہیں سیاست میں ان کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان نظمیں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں وہ سیاست سے گہری وابستگی رکھتے تھے! محبوب نگر

کی سماجی، سیاسی، ادبی خبریں سیاست میں اشاعت کے لیے ارسال کرتے تھے
اچھے صحافی ہیں ایک جریدہ "تعمیر" کے نام سے شائع کرتے تھے محبوب نگر
کی تقریباً تمام ادبی، علمی و تہذیبی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ تھے محبوب نگر
کے صف اول کی اعلیٰ مرتبت شخصیت ہونے کی وجہ سے اہلیان محبوب نگر ان
کی دل سے قدر کرتے تھے عزیز صاحب کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ــــــ

میں اتنا جانتا ہوں کہ انہوں نے مختلف اوراق میں محفوظ اشعار کو

ایک جا کیا تھا۔ عزیز صاحب سے ملاقات کرنے والا ہمیشہ شگفتگی و تروتازگی
محسوس کرتا تھا ان کا تبسم ریز لب و لہجہ مخاطب کو متاثر کرتا ہے۔ رکھ رکھاؤ کے
انسان تھے اپنی کلاسیکی روش پر قائم تھے پیرانی وضع قطع کو ترجیح دیتے تھے اعلیٰ
روایات، انسانی رشتوں اور تہذیبی اقدار کی پاسداری کرتے تھے محبوب نگر کی مقبول
شخصیت تھے تمام اہلیان محبوب نگر میں ایک بزرگ شہری ہونے کی وجہ سے بھی
ان کی تعظیم کرتے تھے عزیز صاحب پان کھانے کے عادی تھے سگریٹ سے اجتناب
کرتے تھے عزیز صاحب مطمئن زندگی گذاری ـــ عمر کا ایک طویل فاصلہ طے
کرنے کے باوجود وہ گرم سفر رہے ہیں رواں دواں شخصیت کے حامل تھے زندگی
کی صالح روایات کے ترجمان تھے یار باش، ہمدرد اور دوستی کے قابل انسان تھے
ان سے کوئی شخص ایک دفعہ دوستی کے رشتہ میں بندھ جاتا ہے تو ان سے جدا نہیں
ہوتا۔ شعری و ادبی محفلوں سے دلچسپی رکھتے تھے ان دونوں ادبی تقاریب کے
اہتمام میں ضرور حصہ لیتے تھے انہوں نے کچھ عرصے پہلے اپنے چند ہم خیال شاعروں
ادیبوں اور دوستوں کے تعاون سے جلسہ اعتراف خدمات ڈاکٹر علی احمد جلیلی

کا محبوب نگر میں کامیاب انصرام کیا۔ جناب زاہد علی خان صاحب نے اس اہم تقریب کا افتتاح کیا تھا۔ بشمول میرے مشاعرہ میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی، رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی، شفیع اقبال، جناب مجیب کوثر، وقار ریاض وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ میزبان منتخب شعراء نے بھی کلام سنایا تھا۔ نائب صدر کمیٹی سکریٹری اقبال اکیڈیمی محبوب نگر عبدالرحیم نے بھی اس تقریب کے اہتمام میں شخصی دلچسپی لی تھی۔ مشاعرہ کے ناظم سلیم عابدی تھے اس موقعہ پر ایک دستاویزی سووینیر ''آئینہ میر قلم'' کے نام سے شائع ہوا جس کے مرتب عبدالعزیز عزیز تھے۔ عبدالعزیز عزیز جب کبھی سیاست آفس آتے اگر میں موجود رہوں تو مجھ سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ میں عزیز صاحب کے خلوص کا اسیر ہو چکا تھا میری یہ خواہش رہتی تھی کہ وہ حیدرآباد میں اہم مشاعروں میں شرکت کرتے رہیں۔ میں نے عزیز صاحب کو کل ہند اتحاد المسلمین کے سالانہ کل ہند تہنیتی مشاعرہ میں مدعو کیا تھا۔ شاعرۂ دکن کے مشاعروں میں وہ بھی پابندی سے شرکت کرتے رہے۔ عزیز صاحب ایک اچھے شاعر تھے عمدہ صحافی تو تھے ہی لیکن ایک وضع دار، مہذب، شائستہ، پُر وقار شخصیت کی حیثیت سے بھی ہم سب کی نظروں میں تھے۔ میں عزیز صاحب جیسی معتبر شخصیتوں کی ہمیشہ قدر کرتا رہا ہوں۔ قدر کرتا رہوں گا۔ ان کا وجود اہل محبوب نگر کے لیے باعث افتخار تھا۔

صابر شاہ آبادی

(یار باش، مخلص شخصیت، معروف سخنور)

مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیتیں اُن لوگوں کو کبھی نہیں بھول سکتیں جو اُن کی زندگی کی اولین ساعتوں میں ہم رکاب رہی ہیں۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی شعبۂ زندگی سے لازماً واسطہ رکھنا پڑتا ہے کسی بھی شعبہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد اس مخصوص شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مراسم کا آغاز ہو ہی جاتا ہے صابر شاہ آبادی کو جب میں ایک شاعر کی نظر سے دیکھتا تھا، تو ان میں وہ تمام شاعرانہ خوبیاں نظر آتی تھیں جو ایک کلاسیکل شاعر کا حصہ ہوتی ہیں مجھے کبھی بھی اس بات سے دلچسپی نہیں رہی کہ کونسا قلم کار اپنی نجی زندگی میں کس حد تک سرخرو رہا ہے ایک عام بات ہے کہ اپنا غم اپنا ہوتا ہے اپنی مشکلات اپنی ہوتی ہیں لوگ مشکلات میں گھرے لوگوں کے ایک حد تک ہم سفر رہتے ہیں منزل تک ساتھ نہیں دیتے پتہ نہیں وہ کون لوگ ہوں گے جو منزلوں تک ہم سفر رہتے ہیں۔ ہر انسان اپنی زندگی کو سنوارنے، بنانے اور اُس کو بلندی سے ہم کنار کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے

ہر شخص کو وہ سب کچھ نہیں ملتا جس کا وہ متمنی رہتا ہے۔ صابر شاہ آبادی نے اپنی زندگی گزارنے کے لیے آسودگی سے قریب ہونا چاہی ہوگی یقیناً ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ معاشی اعتبار سے بھی مطمئن رہے۔ بہرحال جس کی قسمت میں جو لکھا ہوا ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ صابر شاہ آبادی ایک عام آدمی کی طرح معاشرہ میں سانس لیتے رہے۔ لیکن خدائے قدوس نے ان میں شاعرانہ صلاحیتیں ودیعت کر دیں اور بہت جلد اپنی شاعرانہ حیثیت کو شعر و ادب کے حلقوں تک پہونچانے میں کامیاب رہے۔ صابر شاہ آبادی ایک خوش کلام شاعر تھے وہ زائد از ۴۰ برس تک شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ صابر شاہ آبادی ۲۱ جنوری ۱۹۳۲ء کو شاہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۵ کتابوں کے مصنف ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے (۱) رحمت تمام (نعتیہ مجموعۂ کلام) (۲) سلسلۂ انوار (نعتیہ و منقبتی مجموعہ) (۳) قومی و سیاسی نظمیں (۴) شریک وفا (مجموعۂ غزل) (۵) ضامنِ نجات (نعتیہ کلام کا مجموعہ) آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے اُن کا کلام نشر ہوتا رہا۔ شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۱ء میں جشن صابر شاہ آبادی کا اہتمام کیا گیا تھا ان کے شاگردوں میں رزاق اثر، عزیز گجراتی، ساگر شولاپوری اور پیر دبیر اختر شاہ آبادی قابلِ ذکر ہیں ان کا انتقال ۱۴ نومبر ۱۹۹۶ء میں ہوا۔ گلبرگہ میں ادبی ماحول اور مشاعروں کی گہما گہمی نے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ شاہ آباد اور گلبرگہ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے وہ گلبرگہ کے تقریباً ہر مشاعرہ میں شرکت کیا کرتے تھے۔ صابر شاہ آبادی سے میری شاعرانہ جان پہچان کی مدت زائد از تین دہے ہے۔ میں نے صابر شاہ آبادی کے ساتھ کئی مشاعرے پڑھے ہیں گلبرگہ میں متعدد مشاعروں

میں ہی نہیں گلبرگہ کے آس پاس کے علاقوں بیدر، کلیانی، رائچور، ظہیر آباد وغیرہ میں بھی ہم نے مشاعروں میں شرکت کی ہے صابر شاہ آبادی کے ساتھ میں نے بعض کل ہند مشاعرے بھی پڑھے ہیں خاص طور پر بمبئی، ناندیڑ کے مشاعروں میں ہم ساتھ ساتھ رہے۔ غالب صدی تقاریب کے سلسلے میں پونا میں منعقدہ مشاعرہ میں ہم نے شرکت کی تھی۔ صابر شاہ آبادی ترنم میں کلام سناتے تھے۔ ان کا ترنم اپنے ایک مخصوص بانکپن اور اپنے ایک منفرد انداز کا آئینہ دار ہوا کرتا تھا۔ صابر شاہ آبادی نے ہر مشاعرہ میں ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔ کلیانی (بسوا کلیان) میں حضرت عطا کلیانوی کی زیر نگرانی منعقدہ مشاعروں میں ہم بار بار ملتے رہے ہیں کلیانی میں حضرت تاج الدین شہسوار اور سید احمد شاہ کے مشاعروں میں بھی شریک رہے ہیں ظہیر آباد کے اہم شاعر حکیم جمالی کی بزم سخن کے تقریباً تمام سالانہ مشاعروں میں شریک رہے گلبرگہ میں سید احمد صاحب کی زیر نگرانی سالانہ منعقدہ نعتیہ مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ اس دور کے کرناٹک کے مشہور شاعروں میں حضرت عطا کلیانوی رشید احمد رشید (بیدر) سردر مرزائی، ڈاکٹر راہی قریشی، عبدالرحیم آرزو، سلیمان خطیب (گلبرگہ) نے اپنی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر شعری ادب میں نام کمایا۔ یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ گلبرگہ یونیورسٹی سے حضرت عطا کلیانوی اور رشید احمد رشید کے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں ریسرچ کا یہ کام پروفیسر عبدالرزاق فاروقی صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کی شخصی دلچسپی کا مرہون منت ہے صابر شاہ آبادی نے جہاں عمدہ غزلیں کہی ہیں وہیں انہوں نے

متاثر کرنے والی عقیدت میں ڈوبی ہوئی تصنیفیں بھی کہی ہیں۔ صابر شاہ آبادی حیدرآباد کرناٹک کے مقبول شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ صابر شاہ آبادی کو میں نے مشاعروں میں ہمیشہ ترنم میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے بعض ایسے شاعروں کو بھی میں نے دیکھا ہے جو کسی خوش گلو سینیئر شاعر کے ترنم میں کلام سناتے ہیں لیکن صابر شاہ آبادی کا ترنم خود اُن کا اپنا تھا۔ مانگے کا اُجالا نہیں تھا۔ صابر شاہ آبادی ایک یار باش، خوش مزاج، زندہ دل اور دوستی کے قابل انسان تھے ان کی محتاط رہی زندگی کے ہر مرحلہ پر اُن کا ساتھ دیتی رہی۔ انہوں نے بہترین شاعر ہونے کے باوجود کبھی تعلی سے کام نہیں لیا۔ کبھی اس بات کا احساس نہیں دلایا کہ وہ اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے بہتر ہیں یا اُن کے برابر اپنا شاعرانہ قد رکھتے ہیں انہوں نے ادبی حلقوں میں ہمیشہ اپنی شاعرانہ حیثیت کو برقرار رکھا۔ یہ اُن کا پسندیدہ عمل ہی اُن کی مقبولیت کا ضامن ہے نہایت سادہ طبیعت کے ہنس مکھ خوش مزاج، قناعت پسند، بامروت اور باکردار مخلص انسان تھے۔ ان کی اچھائیوں اور اُن کی خوبیوں کی ایک طویل فہرست اُن کے وہ قریبی دوست پیش کر سکتے ہیں جو اُن کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے میں نے انہیں جس رنگ میں بھی دیکھا وہ یکا رنگ تھا۔ جو ہر موسم میں برقرار رہا۔ اور وہ یکا رنگ اُن کی شرافت اور اُن کی طبیعت کی والہانہ بے ساختگی ہے صابر شاہ آبادی نے شاعرانہ لباس شیروانی کی توقیر بڑھائی۔ حیدرآباد کے بعض مشاعروں میں انہوں نے شرکت کی ہے حضرت اوج یعقوبی اور حضرت غزالی ندیم صاحب سے ان کے اچھے خاصے مراسم تھے ان کی دعوت پر

پیرا ہوئے انہوں نے حیدرآباد میں متعدد بعض مشاعروں میں شرکت کی ہے گلبرگہ کے تمام شاعروں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے بنگلور کے مشاعروں میں بھی اُن کا ساتھ رہا ہے شاہ آباد کے شاعروں وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شعری ادب میں بڑا نام کمایا ہے ان کے شاگرد دوست رزاق اثر بھی شاہ آباد کے شاعروں میں اہم مقام رکھتے ہیں رزاق اثر صاحب سے میری ملاقات صابر شاہ آبادی کے توسط سے ہی ہوئی تھی روایت کے تسلسل کے طور پر صابر شاہ آبادی کے بیٹوں کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہے۔ گلبرگہ کے مشہور و ممتاز شاعر محب کوثر سے بھی اُن کے دوستانہ روابط ہیں محب کوثر کے استاد نامور شاعر پنڈت دامودر ذکی (کوڑنگل) سے بھی ان کے شاعرانہ مراسم تھے صابر شاہ آبادی نے اُن کے ساتھ کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔ پنڈت دامودر ذکی نے بھی تا عمر اردو شاعری کی خدمت کی ہے اُن کے کئی شاگرد شعر و ادب کی دنیا میں شہرت حاصل کر چکے ہیں صابر شاہ آبادی کا کلام ملک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتا تھا حیدرآباد کے اخبار سیاست میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدیم شعراء اُٹھتے جا رہے ہیں ان کے نعم البدل مشکل سے ہی نظر آتے ہیں یہ صحیح ہے کہ سلسلہ روز و شب میں ہم سبھی اسیر ہیں اور اپنے اپنے انداز سے اپنی صلاحیتوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے ہیں لیکن وہ لوگ جو معاشرہ کی ناقابل فراموش شخصیتیں ہیں بہت کم ملتے ہیں صابر شاہ آبادی بھی اُن ہی مشہور و معروف لوگوں میں سے ایک ہیں جنہیں معاشرہ کے باشعور لوگ یاد رکھیں گے۔ خاص طور پر شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے رہیں گے۔

وحید مرزا

(کامیاب وکیل، اردو کے خدمت گزار اور مشہور سخنور)

شعر و ادب کی دنیا میں ایسے بھی قلم کار ملیں گے جو اپنے مخصوص پیشے پر کم توجہ دیتے ہوئے اردو زبان کی ترقی و بقا کے لیے سرگرم عمل رہا کرتے ہیں اس طرح کے لوگ آج کے دور میں ہی نہیں ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ جذبۂ خدمت چاہے وہ زبان و ادب سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی مخصوص پیشے سے وہ قابل تحسین ہے۔ قدرت جس شخص سے جو کام لینا چاہتی ہے لیتی رہتی ہے جو لوگ کسی شعبہ میں دل و جان سے مصروف رہا کرتے ہیں ان کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ سچے خدمت گذار ہیں اور اپنی دھن میں کچھ اس طرح کی خدمت انجام دے رہے ہیں جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے۔ بہت کم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اردو کا کوئی قلم کار اردو تحریک سے جڑا ہوا نہ ہو۔ اضلاع آندھرا پردیش کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں میں بہت سے نام نمایاں ہیں زبان و ادب کے سلسلے میں بعض اس قدر سرگرم عمل

رہے ہیں کہ ان کے نام ادبی حلقوں میں اہمیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔
زبان وادب، خاص طور پر مشاعروں کے اہتمام کے سلسلے میں نظام آباد بھی حرف اول کی طرح رہا ہے۔ حیدرآباد کے قریب کے اضلاع میں نظام آباد محبوب نگر، ورنگل کی ادبی سرگرمیاں شہرت رکھتی ہیں۔ ان اضلاع کے علاوہ اور اضلاع میں بھی بہت سے شاعر ملیں گے جو شعر و سخن سے وابستگی رکھتے ہیں اور زبان کی ترقی و نشر و نمو میں کام کر رہے ہیں۔ ہر ایک زمانہ میں ہر ضلع کا ادبی ماحول قابلِ رشک نظر آتا تھا لیکن اب وہ بات نہیں رہی پھر بھی جن اضلاع میں زبان وادب کا کام ہو رہا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔
مرزا وحید بیگ نظام آباد کے بیشتر و مقبول شاعروں میں کچھ زیادہ اہمیت کے حامل نہیں جنھوں نے شاعری سے زیادہ اپنا وقت اردو زبان کی سرگرمیوں کے لیے دیا۔ اپنے دور میں بے شمار مشاعرے منعقد کیے۔ کئی اردو کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں لایا۔ انجمن ترقی اردو سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔
نظام آباد میں ہونے والے بڑے بڑے جلسوں، کانفرنسوں اور مشاعروں کے انعقاد میں پیش پیش رہتے تھے انجمن ترقی اردو سے متعلق ہر مسئلہ کو ایوانِ حکومت تک پہونچانے میں شخصی دلچسپی لیتے تھے سکریٹری انجمن (حیدرآباد) کی ہدایت اور اپنے اختیارات سے بہت سے ادبی کام انجام دیئے۔ انجمن ترقی اردو سے ان کی وابستگی کے زمانے میں کئی بار مشاعروں میں، میں شرکت کر چکا ہوں۔ مشاعروں کا انعقاد ہو کہ کانفرنسوں کا اہتمام اپنے پیشۂ وکالت کی مصروفیات کو متاثر کیے بغیر اردو کا کام کرتے تھے۔

مرزا وحید بیگ ایک کامیاب وکیل تھے کئی موکلین کی معمولی فیس پر خدمت انجام دیتے تھے اس کی وجہ ایک تو ان کا مستحکم معاشی موقف تھا دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی خدمت انجام دینے میں فراخ دلی سے کام لیتے تھے غریب موکلین کی خدمت بغیر فیس کے بھی انجام دیتے تھے مرزا وحید بیگ صاحب نظام آباد کے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کا اصل نام مرزا وحید بیگ ہے اُن کے والد کا نام رشید احمد بیگ ہے۔ وحید مرزا ۲۶ نومبر ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور پھر ایل ایل بی کا امتحان کامیاب کیا۔ پیشہ وکالت سے وابستہ ہو گئے۔ اُردو اکیڈیمی کے رکن بھی رہے اور کارگذار صدر بھی۔ اُردو اکیڈیمی کے علاقائی سنٹر نظام آباد سے بھی وابستہ رہے۔ ساؤتھ انڈیا اُردو اکیڈیمی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے ان کے چار شعری مجموعے ہم لوگ، اے امیرِ کارواں، اندرا گاندھی۔ بزمِ انجم اور اندازِ غزل شائع ہو چکے ہیں اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ۲۰۰۱ء میں انہیں کارنامۂ حیات کے ایوارڈ سے نوازا۔ ان کا ۲۰۰۲ء میں انتقال ہوا مرزا وحید بیگ بہت اچھے انسان تھے نظام آباد میں مہمان شاعروں کی میزبانی میں پیش پیش رہتے تھے نظام آباد کے شہریوں میں ان کا ایک اہم مقام تھا انہوں نے مسلمانوں کے بیشتر مسائل کی یکسوئی کی۔ حکومت کے عہدہ داران سے ان کے اچھے خاصے مراسم تھے چاہے وہ زبان و ادب کے معاملات ہوں کہ مسلم اقلیت کے مسائل ہوں۔ وہ کامیاب رہبری و پیروی کرتے تھے مرزا وحید بیگ سے میرے شاعرانہ مراسم آخر تک باہم بستر رہے۔ وحید مرزا صاحب نے مجھے نظام آباد کے کئی شاعروں میں

مدعو کیا۔ یہاں تک کہ وہ بودھن میں ہونے والے مشاعروں میں بھی مدعو کیا کرتے
تھے انتقال سے کچھ برس پہلے وہ زیادہ تر حیدرآباد میں مقیم رہنے تھے مہدی پٹنم میں
ان کا مکان ہے ادارۂ بیراشہر میرے لوگ، ایوان پریس منظم ماہ شجیع، خورشید
احمد جامی میموریل اکیڈیمی اور سوغاتِ نظر کے مشاعروں اور ادبی جلسوں میں
شرکت کرتے تھے شہر کے بعض نمائندہ مشاعروں میں بھی کلام سناتے تھے وحید مرزا
تحت میں کلام سناتے تھے ترقی پسند خیالات کے حامی تھے ان کے کلام میں ترقی پسندانہ
خیالات جابجا ملیں گے۔ ان کی کئی نظمیں ترقی پسند خیالات کی ترجمان ہیں انجمن
ترقی اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تھے
اردو مجلس کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے نظام آباد کے شاعروں میں ماہنامہ
"گونج" کے مدیر نامور شاعر جمیل نظام آبادی سے بہت قریب تھے اردو کے بیشتر
جلسے اور مشاعرے ان دونوں کی مشاورت سے طے پاتے تھے وحید مرزا اردو
کے ایک خاموش خدمت گذار تھے۔ پُرخلوص، ہمدرد انسان تھے حیدرآباد میں ان
بیسیوں شاعر دوست ہیں چونکہ کھلا دل ودماغ رکھنے والی شخصیت تھے اس لیے
ان کی دوستی کا حلقہ بڑھتا چلا گیا۔ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے جلسوں اور مشاعروں
میں شرکت کرتے تھے اردو اکیڈیمی کے مشاعروں اور جلسوں میں بھی شرکت کیا کرتے
بہت سے ادبی وشعری معاملات میں میرے ہم خیال تھے وحید مرزا تمام زندگی ا
وضع داری پر قائم رہے۔ ادبی محفلوں میں اپنی شرکت سے یہ اشارہ دیتے تھے
وہ شریف النفس، اصول پسند، مہذب انسان ہیں۔ آدابِ محفل کا خیال ر
تھے شاعروں، ادیبوں سے اپنی رسم وراہ کو استوار رکھتے تھے اردو کے بیشتر شاع

میں ان کا شمار ہوتا ہے مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، سلیمان اریب سے بھی ان کے مراسم تھے اپنے کلام پر ان شعرائے کرام کی داد و تحسین سے مسرور رہا کرتے تھے کبھی کبھی اپنی شاعری کے بارے میں کہتے تھے کہ مخدوم محی الدین اور شاہد صدیقی میری شاعری پسند کرتے تھے۔ اخبار سیاست میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے آل انڈیا ریڈیو سے اکثر دفعہ انہوں نے اپنا کلام سنایا۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی سناتے رہے۔ حیدرآباد میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور پروفیسر مغنی تبسم کی شاعرانہ و ادیبانہ قدر و قیمت کا اعتراف کرتے تھے حیدرآباد کے ان سے جونیر شاعروں میں راقم الحروف اور رئیس اختر کو پسند کرتے تھے مرزا وحید بیگ نے اپنی ساری زندگی با وقار انداز میں گزاری۔ خوش اخلاق، خوش مزاج خوش لباس انسان تھے وحید مرزا کا ہاتھ بڑا کشادہ تھا داد و دہش کے معاملے میں حاجت مندوں کی دعائیں لیتے رہے۔ نظام آباد کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں مسلمانوں کی حکومت کے سربراہوں سے بھرپور نمائندگی کرتے رہے نظام آباد میں ان کی کافی عزت تھی انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کے سلسلے میں مولوی حبیب الرحمن اور جناب عابد علی خاں سے انکی قربت تھی۔ دفتر سیاست آتے تھے عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب سے انکے دیرینہ مراسم تھے۔ مرزا وحید بیگ کے وجود سے ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شگفتگی کا احساس ہوتا تھا اچھے اور معتبر انسان تھے اپنی شاعری کے بارے میں بے نیاز تھے نظام آباد میں گذشتہ بیس برسوں میں شعر و ادب کی دنیا میں سب سے زیادہ شہرت وحید مرزا کو حاصل تھی سماجی طور پر مخلص شاعر اور ایک کامیاب ایڈوکیٹ تھے اردو کے سچے خدمت گزار تھے مجھے ایسے ایک مخلص انسان کی مستقل جدائی کا ہمیشہ احساس رہے گا ▲

حکیم جمالی

قلندرانہ طبیعت رکھنے والے مخلص شاعر

شعرو حکمت سے وابستہ لوگ چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں کیوں نہ ہوں معاشرہ میں اپنی ایک مخصوص پہچان کے ساتھ رواں دواں رہتے ہیں فنون لطیفہ سے وابستگی ایک فن کار کو اس کی اپنی دھن، اپنی فکر اور اپنی ایک خاص دنیا سے کچھ اس طرح جوڑ دیتی ہے کہ وہ اسی میں مست و سرشار رہتا ہے کچھ فن کار ایسے بھی ہوتے ہیں جو پوری طرح دنیا داری کو نبھاتے ہوئے اپنے فن کے فروغ میں مصروف رہتے ہیں چونکہ انسان کے مزاج میں بیشتر صلاحیتوں میں تضاد رہتا ہے اس لیے کسی فن کار کے بارے میں قطعیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا فن کس طرح کا ہے اور وہ کس منزل پر پہونچ جائے گا۔ فنون لطیفہ میں شاعری کو جو اعزاز حاصل رہا ہے وہ کسی اور فن میں نہیں ہے اس لیے تمام فنون لطیفہ میں شاعری کو اولیت دی گئی ہے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ شاعری تمام علوم و فنون میں سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع مقام رکھتی ہے لیکن دیگر علوم و فنون جیسے رقص و

موسیقی، سنگ تراشی و مصوری بھی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں فن کار کے فن کا ر
وجود کے لیے کسی ایک خاص علاقہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں
کیوں نہ رہے اپنے فن کے مظاہرہ سے ساری دنیا کو متوجہ کرتا ہے لیکن جہاں تک
وسائل اور تشہیر کا مسئلہ ہے وہ ہر فن کار کے مقدر کی بات ہے عام طور پر گاؤں،
دیہاتوں اور اضلاع کے مقابلے میں شہروں میں رہنے والے فن کاروں کو اپنے فن
کے اظہار کے لیے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گاؤں اور شہر کے
درمیانی دیوار کی وجہ سے بعض اضلاع کے فن کار وہ شہرت نہیں پا سکے جو شہر کے
فن کار پا سکے۔ حیدرآباد ہر دور میں شعر و ادب کے لیے ایک اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں
فنونِ لطیفہ کو پروان چڑھانے میں کافی سہولتیں مہیا ہیں مختلف فنون سے
وابستہ لوگ اپنے اپنے فن کی خدمت میں مصروف ہیں اور جن میں بعض شاہکار
کا درجہ رکھتے ہیں حیدرآباد کے اضلاع میں بھی مختلف فنون سے وابستہ لوگ اپنے
محدود وسائل کے باوجود اپنے فن کو ترقی دینے میں نہ صرف مصروف ہیں بلکہ اپنے فن
کا احساس دلانے کے لیے نئے نئے وسائل کے متلاشی بھی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے
کہ کچھ فن کار اپنی افتادِ طبع اور اپنے ایک مخصوص مزاج کی وجہ سے اپنے آپ میں مست
رہا کرتے ہیں۔ افتادِ طبع کی یہی تصویریں رنگتے ہوئے ایک شاعر حکیم جمالی بھی تھے جو
ظہیرآباد کے متوطن تھے۔ حکیم جمالی کا تعلق شعبۂ درس و تدریس سے تھا برسوں اس پیشہ سے
وابستہ رہے۔ جمالی اپنی شاعرانہ وضع داری میں اپنی آپ مثال تھے میں اپنی ۴۹ سالہ شاعرانہ
زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے جب سابق ریاست حیدرآباد کے اضلاع کے شاعروں پر نظر
ڈالتا ہوں تو مجھے رشید احمد رشید (میدک)، سلیمان خطیب، سردر مرزائی، ڈاکٹر راہی، عبدالرحیم آرزو

(گلبرگہ) عطا کلیانوی (بسواکلیان) صابر شاہ آبادی (شاہ آباد) مسافر نلگنڈوی (نلگنڈہ) حضرت صولت (محبوب نگر) پنڈت دامودر ذکی (کوڑنگل) اور اس طرح کے کچھ اور شاعروں کی بے ساختہ یاد آتی ہے جو اپنے اپنے رنگ میں اپنی منفرد پہچان کے ساتھ شعروادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ حکیم جمالی سے میرے مراسم زائد از ۴۰ برس سے تھے ظہیر آباد میں انہوں نے جناب ایم باگا ریڈی سابق ایم ریل اے و سابق ایم پی و ریاستی وزیر کی مشاورت سے ۱۹۵۴ء میں شعری و ادبی انجمن بزم سخن کے نام سے قائم کی تھی۔ بزم سخن کے مشاعرے سارے اضلاع کے شاعروں میں شہرت رکھتے تھے حیدرآباد کے مشہور و معروف شاعر بھی ان مشاعروں میں شریک رہے ہیں جن میں اوج یعقوبی، کنول پرشاد کنول، سلیمان اریب، خیرات ندیم، طالب رزاقی، این احمد تاب کے علاوہ اس دور کے نوجوان شعراء بھی شریک رہا کرتے تھے۔ باگا ریڈی صاحب نے ہمیشہ ان مشاعروں کی سرپرستی کی۔ حکیم جمالی، باگا ریڈی صاحب کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے دونوں ہم وطن بھی تھے اس لیے بھی ہر موسم میں ان دونوں کی دوستی مثالی رہی۔ ظہیر آباد کے مشاعروں میں رشید احمد رشید، عطا کلیانوی، سلیمان خطیب، سرور مرزائی، صابر شاہ آبادی اور ڈاکٹر راہی قریشی بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد سے میں اور رئیس اختر نے ظہیر آباد میں بزم سخن کے زیر اہتمام منعقدہ کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔ حکیم جمالی نے اپنی شخصی دلچسپی سے ظہیر آباد میں شعروشاعری کا ماحول بنایا۔ ظہیر آباد میں کئی نئے شاعروں کی سرپرستی کی۔ اہلیان ظہیر آباد نے بلا تخصیص مذہب و ملت مشاعروں کے انصرام و اہتمام میں ساتھ دیا۔ باگا ریڈی کا ظہیر آباد میں کافی اثر تھا جس کی وجہ سے مشاعرے منعقد کرنا آسان رہا۔ بعد میں بزم سخن کی ادبی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ بزم سخن کی شعری و ادبی سرگرمیوں کے

ایک اہم وصف تھا۔ نہایت مخلص، دوستی کے معیار کو سمجھنے اور دوستی کو سلیقے سے نبھانے والے انسان تھے جب کبھی وہ ظہیر آباد میں کوئی بڑا مشاعرہ منعقد کرنا چاہتے یا اردو کانفرنس کا انعقاد ان کے پیش نظر رہتا تو وہ مجھ سے ضرور ربط پیدا کرتے تھے بعض دفعہ مجھ سے پروگرام کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے حیدر آباد آتے تھے حکیم جمالی نے شاید ہی حیدر آباد کے کسی مشاعرہ میں شرکت کی ہو البتہ بیدر، گلبرگہ، کلیانی کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے حکیم جمالی نے اپنی ساری زندگی شاعرانہ انداز سے گزاری۔ خود نمائی ان سے بہت دور رہی۔ دوسروں کی مدد کے لیے پیش پیش رہا کرتے تھے ظہیر آباد میں اگر اردو کا کوئی مسئلہ سرکاری سطح پر توجہ کا طالب رہتا تو وہ فی الفور باگا ریڈی صاحب سے رجوع ہوتے تھے۔ ظہیر آباد میں باگا ریڈی اور حکیم جمالی نے اپنی منفرد پہچان بنالی تھی باگا ریڈی صاحب نے سیاسی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ اور حکیم جمالی نے شعری و ادبی حلقوں میں اپنی شاعرانہ حیثیت سے اپنا مستقل مقام بنالیا۔ حکیم جمالی باگا ریڈی صاحب کے ادبی معاملات میں بھی معاون رہے۔ ان کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں دلچسپی لیتے رہے باگا ریڈی صاحب کو اردو زبان و ادب سے گہری وابستگی ہے باگا ریڈی صاحب منشی فاضل کے ہم جماعت ہیں حکیم جمالی کا ایک مجموعہ کلام "۔۔۔" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ کلام ترنم میں سنانے تھے اور مشاعروں میں کامیاب رہتے تھے حکیم جمالی نے باگا ریڈی صاحب کی شخصیت پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کر کے "روشن" کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا اس کے علاوہ "عکس حسن" و "اعتراف خدمات" بہ باگا ریڈی" بھی مرتب کیا ان حکیم جمالی کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کا ذوق تھا حضرت حبیب اللہ وفا، عبد الحمید شوق اور اسد اللہ حقیقی تارنے ان کے ذوق شعری کو نکھارا

تقی الحسن

میرے شفیق استاد۔ محترم شخصیت

وہ اساتذہ جو کسی طالب علم کی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں کچھ زیادہ ہی مہربان رہے ہیں وہ دیگر اساتذہ کے مقابلے میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں طالب علم انہیں کبھی نہیں بھلا سکتے۔ آج سے ۵۰ سال پہلے کے اساتذہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یوں تو میری ابتدائی تعلیم کے زمانے میں میرے پہلے استاد میرے بابا تھے جن سے میں نے اردو اور عربی کی ابتدائی تعلیم پائی۔ مجھے یاد نہیں کہ مجھے سکول میں میرے کس ماموں یا کس ماموں زاد بھائی نے شریک کروایا تھا۔ میرے بچپن میں میرے والد محترم کا انتقال ہوا۔ میرے گھر کے لیے کوئی معاشی مسئلہ نہیں تھا۔ چھوٹی زمین داری تھی۔ نوکروں سے کھیتوں کی کاشت کروائی جاتی تھی اُس زمانے میں ایسا رواج تھا کہ کاشت کار محنت کرتا۔ کاشت کے لیے صرف بیج یا کھیت کے مالکین دیا کرتے تھے۔ میں ۱۹۳۵ء میں ہمنا آباد ڈ بیدر میں پیدا ہوا۔ میں بچپن میں بہت صحت مند تھا۔ تھا تو کم عمر لیکن بڑی عمر کا دکھائی دیتا تھا۔ تاریخ

پیدائش اندازہ سے لکھوائی گئی۔ میں نے ابتدائی تعلیم کے بعد ہمنآباد کے اسکول میں
تعلیم پائی۔ ہفتم کامیاب کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے حیدرآباد آگیا ہمنآباد
میں صرف ایک بڑا اسکول تھا جہاں صرف ہفتم تک تعلیم ہوتی تھی جس کے بانی
سلیم الدین صاحب تھے وہ اسی اسکول کے صدر مدرس بھی تھے ان کے انتقال کے
بعد اسکول کے صدر مدرس نبی الحسن صاحب بن گئے جو دیو بند کے فاضل نہایت
لائق انسان تھے۔ اس دور کے میرے استادوں میں نبی الحسن صاحب کے علاوہ
علیم الدین، محمد قاسم، رشید صاحب، سید محمد صاحب، جبار صاحب، اسمٰعیل
صاحب اور ایک ہندو استاد تھے جو ڈرائنگ سکھاتے تھے غالباً میں جماعت
چہارم کا طالب علم تھا اس وقت نواب بہادر یار جنگ اسکول کے معائینے کے
لیے آئے تھے مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میرا نام پوچھا تھا اور نام کی معنیٰ بھی
دریافت کیا تھا۔ میں اسکول کا ایک ذہین طالب علم سمجھا جاتا تھا میری اُردو
اور فارسی کافی اچھی تھی جس زمانے میں اسکول کے صدر مدرس سلیم الدین صاحب تھے
اُس زمانے میں تعریف کے بعد (حمد کے بعد) اسکول میں داخل ہونے سے پہلے طلباء جمع
ہوتے اور تا ابد خالقِ عالم یہ حکومت یا شہ رہے عثمان علی خان بادشاہ وقت
تھے اُس دور کے ہر اسکول میں یہ اشعار پڑھائے جاتے تھے۔ اسکول میں
داخل ہونے سے پہلے مسلم طلباء سے یہ پوچھا جاتا تھا کہ فجر کی نماز کس، کس
نے پڑھی؟ کس نے نہیں پڑھی؟ جن طلباء نے نماز نہیں پڑھی اُن کی نشاندہی
متعلقہ استاد کرتے تھے نماز نہ پڑھنے والے طلباء کو صرف سلیم صاحب سزا دیتے
تھے اور بید کی ایک بڑی چھڑی سے ہتھیلی پر اس طرح مارتے کہ ہتھیلی مار کی وجہ

سے ہتھیلی پھٹ جاتی۔ سلیم صاحب کو ان کی زندگی کے آخری دنوں میں فالج ہو گیا تھا
اس کے باوجود وہ ایک بیل کی
بنڈی میں بیٹھ کر اسکول آتے۔ ان کے ہاں ایک ڈنڈا رہتا تھا کبھی کبھی ڈنڈا
ہتھیلی پر مارتے ڈنڈے کی مار سے ہتھیلی سرخ تو نہیں ہوتی تھی لیکن مار کی وجہ
سے دیر تک جھنجھناہٹ اٹھتی تھی۔ میرے ہم جماعت طلباء میں یہ نام یاد رہ گئے
ہیں۔ رشید میاں، خورشید، گریا دیا اور اگرڈی۔ رشید میاں
حیدرآباد میں ہیں خورشید گلبرگہ میں مشہور وکیل ہیں۔ گریا دیا کا انتقال
ہو چکا ہے اور ویرپکشپا اگرڈی ہمنا آباد میں مشہور وکیل ہیں۔ میرے
والد تاجر پارچہ تھے اور جامع مسجد ہمنا آباد کے خطیب بھی تھے والد کے انتقال
کے بعد میرے والد کے کاروبار میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی عبدالحق صاحب جو
میرے بہنوئی بھی تھے) نے سنبھالا۔ میرے سات ماموں تھے جن میں کچھ تاجر تھے
کچھ ملازم سرکار۔ میرے دو ماموں کا تعلق پیشۂ درس و تدریس سے تھا۔
اور ایک ماموں حیدرآباد میں تھے جو تھے جن کا تعلق محکمہ پولیس میں محرر کی حیثیت سے
تھا اور ایک ماموں حبیب الدین اللہ شریف میں صیغہ دار تھے ان دنوں
میرے حقیقی بہنوئی غوث محی الدین حیدرآباد میں ملازم سرکار تھے جن کا محکمہ مال
سے تعلق تھا وہ انسپکٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہو گئے، چونکہ ہمنا آباد میں
مڈل اسکول تک تعلیم ہوتی تھی۔ مڈل کامیاب کرنے کے بعد میں اعلیٰ تعلیم
کے لیے حیدرآباد آگیا جبکہ میری والدہ اور میرے سرپرست بہنوئی، میرے چچا
اور ماموں صاحبان یہ چاہتے تھے کہ میں ہمنا آباد میں تجارت کروں۔ لیکن میں

نے اپنی والدہ کو ہنمکنڈہ بلالیا۔ اور حیدرآباد آگیا۔ حیدرآباد آنے کے بعد سے آج تک کی میری طویل زندگی کے بارے میں میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس لیے کہ مجھے اپنے استاد نبی الحسن کے بارے میں لکھنا ہے۔ یعنی مڈل اسکول کی تعلیم کے زمانے تک نبی الحسن صاحب، دیوبند کے فاضل تھے بے حد لائق و فائق استاد تھے۔ فارسی زبان کے ماہر تھے جماعت ہفتم میں اردو فارسی پڑھاتے تھے۔ مولوی نبی الحسن صاحب، سلیم صاحب کے انتقال کے بعد صدر مدرس بنے۔ ان کی رہائش اسکول سے متصل مکان میں تھی وہ تنہا اس مکان میں رہتے تھے ان کے بیوی بچے مظفر نگر (یوپی) میں رہتے تھے اگرچہ اسکول کا چپراسی ان کے گھر پر متعین تھا لیکن وہ خود پکاتے تھے۔ ہم کچھ طلباء کو فارسی گھر پر بھی پڑھاتے تھے بہت بڑا مکان تھا مکان کے اندر بیٹھنے کا دالان کے بعد کھلی زمین تھی جو ہمیشہ ہری بھری رہتی تھی اُس زمانے میں کون کون سے طلباء ان سے فارسی سیکھنے آتے تھے مجھے ان کے نام نہیں معلوم۔ لیکن میں پابندی سے اُن کے ہاں جاتا تھا بعض دفعہ وہ مجھے شریک طعام بھی کرتے تھے وہ جوار کی روٹی بہت شوق سے کھاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے جوار کی گرم گرم روٹی میں اوپر کے حصہ کو علحدہ کر کے دو چمچہ خالص گھی ڈالتے تھے روٹی اس قدر لذیذ ہوتی تھی کہ اُس کا مزہ مجھے آج بھی یاد ہے میری فارسی عام طلباء سے اچھی تھی تمام طلباء میں، میں اُن کا شاگرد رشید تھا مجھے یاد ہے کہ جب میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا تو وہ مجھے اس قابل بنا دیتے تھے کہ میں فارسی میں مضامین لکھتا تھا۔ وہ میری فارسی دانی سے بے حد خوش ہوتے تھے کبھی کبھی شام میں استادِ محترم نبی الحسن صاحب سے ملاقات کے لیے ہنمکنڈہ کے

منتظم پولیس نظام الدین بھی آتے تھے نہایت وجیہہ انسان تھے جو میرے ماموں عبدالغفور صاحب کے اچھے دوست تھے۔ نظام الدین صاحب بھی یوپی کے تھے شاید اس لیے نبی الحسن صاحب سے ان کے اچھے خاصے مراسم تھے وہ اس دور کے بہت ہی قابل منتظم پولیس تھے نبی الحسن صاحب کا ایک بیٹا بھی تھا جو کچھ عرصہ ہمتاباد کے اسکول میں زیرِ تعلیم رہا نبی الحسن صاحب کو کبوتر ولکے شکار کا بہت شوق تھا ان کا نشانہ اچھا تھا کبھی کبھی شام کے وقت ندی کے کنارے شکار کے لیے چلے جاتے مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے دو تین کبوتروں کا شکار کرتے تھے نبی الحسن صاحب دراز قد نہایت خوبصورت انسان تھے۔ ایک عام استاد کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے اور صدر مدرس بننے کے بعد ان کا انتظامیہ قابلِ رشک حد تک مشہور تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُس دور کے تمام اساتذہ دیانت داری اور فرض شناسی کے جذبہ کے تحت اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسکول کے سب سے جونیر استاد علیم الدین چھوٹی جماعتوں میں اردو پڑھاتے تھے اس زمانے میں ہر مضمون کے علیحدہ علیحدہ استاد ہوتے تھے دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ غالباً میرے ہفتم جماعت کی طالب علمی کے زمانے میں عبدالجبار اور اسمٰعیل صاحب استاد مقرر ہوئے تھے میں تمام اساتذہ کا احترام کرتا تھا مجھ پر ہی کیا موقوف تھا تمام طلبا اپنے اساتذہ کا احترام کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ہی شرارت نہیں کرتے تھے چونکہ ہماری دکان کے تمام کھاتے مرہٹی میں لکھے جاتے تھے کھاتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے میرے سرپرست

اسکول کے اوقات کے بعد اسکول کے ایک ٹیچر کے پاس مرہٹی سیکھنے کے لیے بھیجوائے تھے میں نے کچھ دن ایک مندر (مٹھ میں) جو ہمت آباد کے بازار سے متصل تھا چبوترے پر بیٹھ کر مرہٹی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن بعد میں سب کچھ بھول گیا میرے ایک شفیق ہندو ٹیچر بھی تھے جو اسکول کے علاوہ اپنے گھر پر طلباء کو ڈرائنگ سکھاتے تھے میں ان کے گھر ڈرائنگ سیکھنے جاتا تھا پولیس ایکشن کے زمانے میں میں حیدرآباد میں تھا حالات بہتر ہونے کے بعد ہمت آباد آیا۔ اپنے اسکول کے ساتھی گرباد یا سے ملاقات رہی۔ پھر اس کے بعد ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ویریکٹپا اگرمی سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے اس زمانے کے ہمت آباد کے تمام لوگ شیر و شکر کی طرح رہتے تھے ہمت آباد میں تجارت پیشہ بہت سے لوگ تھے بعض دکانیں ایسی بھی تھیں جن کے مالکین ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی۔ ۵۰ برس پہلے جس اسکول میں میں نے اپنی ابتدائی تعلیم پائی تھی اس اسکول کی عمارت کو دیکھنے کے لیے ۵ سال پہلے گیا تھا میں کچھ اس طرح جذباتی ہو گیا تھا کہ اپنے اسکول کے باب الداخلہ سے ہی واپس لوٹ آیا۔ میں نے دیکھا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ جب ابتدائی تعلیم کے زمانے کے استاد یاد آتے ہیں تو فرطِ عقیدت سے خود بہ خود سر جھک جاتا ہے۔